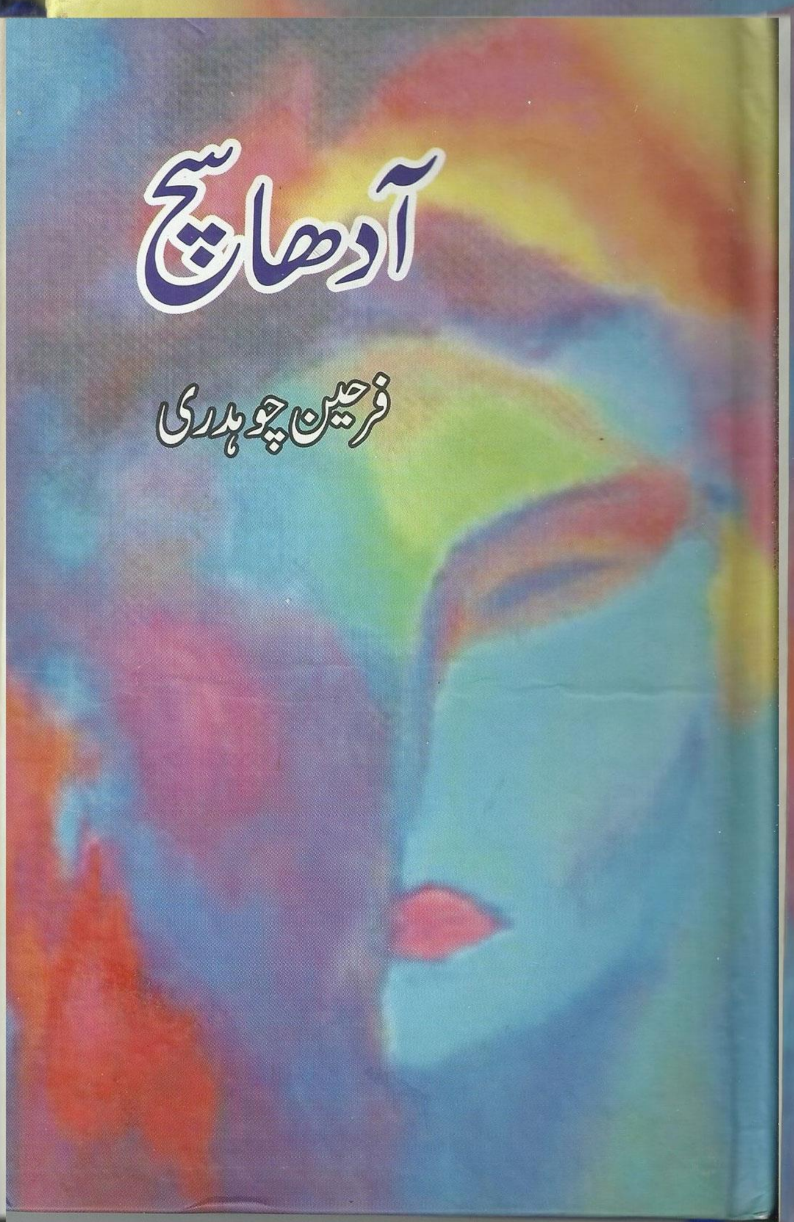


آدھا سچ

فرحین چوہدری

دستاویز مطبوعات لاہور

آدھا سچ

فرحین چوہدری

دستاویز مطبوعات لاہور

حیدی اور کوکی

کے نام

دستاویز کی دستاویز کتابیں

اہتمام و اشاعت

اشرف سلیم

نام کتاب: آدھا سچ

مصنف: فرحین چوہدری

اشاعت: مارچ، ۲۰۱۱

مشینی کتابت: عدنان اشرف

سرِورق: ارسلان

قیمت: ۲۰۰ روپے (پاکستان)

۱۰ ڈالر (بیرونِ ملک)

دستاویز

سی159-چناب بلاک نمبر 10 علامہ اقبال ٹاؤن لاہور فون: 03334344716

ای میل: saleemashraf86@yahoo.com

"کوئی انسان ایسی کوئی چیز تم پر منکشف نہیں کر سکتا جو تمھاری صبح عرفان کے دُھندلکے میں نیم خوابیدہ نہ ہو"

خلیل جبران

مَیں مانگتی ہی رہ گئی سائے کی زندگی
سورج مرے وجود میں جلتا چلا گیا

(فرحین)

فہرس

پڑھنے والو کے لیے!

پہلی کتاب ''سچے جھوٹ'' بھی بس ''آپا دھاپی'' میں چھپی۔ پانچ سال چپ سادھ کر بیٹھ گئی کہ گھر میں چھوٹی چھوٹی دو عدد رونقوں نے مجھے اپنا اسیر کر لیا تھا۔

اب وہ خود باہر جھانکنے کے قابل ہو گئے ہیں تو مَیں نے بھی اَدبی سفر کے لیے پر تولے ہیں۔

مفتی جی کہا کرتے تھے

''کڑیے یا تے لکھنا چھڈ دے تے یا روز لکھیا کر''

مَیں کہتی تھی

''لکھاں گی وی ضرور تے روز وی نئیں لکھا گی۔۔۔''

اُنھوں نے کہا تھا ''تے فیر لکھدی رہ تے دُکھی رہ''

شاید وہ جانتے تھے کہ ہر تخلیق کا ''بالن'' دُکھ ہی ہیں، اپنے ہوں یا پرائے۔۔۔۔ بے تحاشا شستیوں (صرف چھپوانے کی حد تک) باقی ''آدھا سچ'' آپ اور مَیں مل کر ڈھونڈتے ہیں۔۔۔ شاید کبھی مل جائے!

ان سب دوستوں کی محبت کا بار ہمیشہ کاندھے پر رہے گا، جنھوں نے غیر محسوس طریقے سے مجھے یہ کتاب چھپوانے پر اکسایا۔۔۔

مُنیر نیازی کی زبان میں بات ختم کرتی ہوں:

کجھ انج وی راہواں اوکھیاں سن
کجھ گل وچ غماں دا طوق وی سی
کجھ شہر دے لوگ وی ظالم سن
کجھ سانوں مرن دا شوق وی سی

فرحین چوہدری

پُل صراط

شام کا اندھیرا دُور دُور تک اپنے پر پھیلائے کھڑا تھا۔ اس شہر خموشاں کی صاف ستھری، مگر اندھیری سڑکوں پر اِکا دُکا لائٹس کے جگنو چمک رہے تھے۔ آج آفس میں انتہائی اہم میٹنگ کے بعد دن بھر کے تنے ہوئے اعصاب اب ڈھیلے پڑ رہے تھے۔ پُرسکون ہو رہے تھے۔ پٹھانے خان ''میڈا عشق وی توں۔۔۔'' بڑے جذبے کے ساتھ گا رہا تھا اور میری گاڑی روانی کے ساتھ پٹھانے خان کی آواز کا ساتھ دیتے ہوئے کسی سچے سُر کی مانند ہوا میں تیرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی اچانک مجھے شبہ ہوا کہ سڑک کنارے کسی خاتون نے ہاتھ دیا ہے۔ گاڑی کو مَیں نے بریک لگائی اور گاڑی ریورس کی۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ کالج یونیفارم میں ملبوس ایک لڑکی کا ہاتھ ہوا میں معلق تھا، جو مجھے واپس ہوتا دیکھ کر خود بخود پہلو کے ساتھ آن لگا۔ لڑکی نے ایک لحظہ بھی دیر کیے بغیر فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا اور دھم سے میرے ساتھ بیٹھ گئی۔۔۔

''کہاں جائیں گی آپ؟''

میرے استفسار پر اُس نے چونک کر میری جانب دیکھا، انتہائی مایوسی کا تاثر ایک لمحہ کے لیے اُس کی آنکھوں میں اُبھرا اور پھر ڈوب گیا۔

''وہ مَیں کہیں بھی نہیں''

وہ گڑبڑا سی گئی۔

"کیا مطلب"؟

اب چونکنے کی میری باری تھی۔ اس نے ایک گہرا سانس لے کر جیسے اپنے آپ کو سنبھالا دیا اور پھر بولی:

"میں ایک طوائف ہوں"

اس لمحے اگر کوئی توپ بھی میرے کان کے قریب پھٹتی تو شاید اتنا بڑا دھماکہ نہ ہوتا۔۔۔ کچھ لمحے ہم دونوں خاموش رہیں۔ آتش فشاں پھٹنے کے بعد کی خاموشی! میرے بوائے کٹ ہیر سٹائل ڈارک گلاسز اور Get up کی وجہ سے۔ شام کے دھندلکے میں وہ مجھے Merc میں سوار کوئی بڑی اسامی سمجھ بیٹھی تھی۔ میں نے سر گھما کر اس کا جائزہ لیا۔ کالج یونیفارم جاگرز۔۔۔ مہک سے معطر! وہ سادہ سا سراپا کسی طور بھی مشکوک نہیں لگ رہا تھا۔ "Are you sure" میں نے چیختے چلاتے سناٹے سے گھبرا کر پوچھا جواباً وہ ہنس پڑی۔ ایک بے ضرر سی ہنسی۔۔۔ نہیں یہ ہنسی کسی گھر اجاڑنے والی کی تو نہیں میرے تصور میں وہ مکروہ چہرے اور مکروہ ہنسی گھوم گئی۔ جس کا Image پیدا ہوتے ہی ہم عورتوں کا ذہن پر بنا دیا جاتا ہے۔ کسی چڑیل کا Image۔۔۔ جو انسانوں کی خوشیوں اور عورتوں کے سکھ چین کی دشمن ہوا کرتی ہے۔

"کہاں رہتی ہو؟"

"شرفا کی بستی میں"!

لہجہ کاٹ دار تھا۔

"لیکن تمھارا یہ لباس۔۔۔۔۔"

میں نے فقرہ اُدھورا چھوڑ دیا۔

"شک سے بالاتر۔۔۔ مرد کی نفسیات کے عین مطابق۔۔۔۔۔"

اَب کی بار وہ بے حد پکے کاروباری انداز میں بولی۔

"اوہ"!

لیکن میرے ذہن میں ایک معمہ بے دار ہو چکا تھا۔

"تمھارے والد تو ہوں گے۔ کیا کرتے ہیں؟"

میں اَب تک اسے محض کوئی بگڑی ہوئی لڑکی سمجھ رہی تھی، جو کسی انوکھے پن کی تلاش میں منفرد بننے کے چکر میں احمقانہ حرکتیں کرتی پھر رہی ہو۔

"میرا باپ میری کمائی کھاتا ہے۔"

بے حد پُرسکون لہجہ مجھے بے چین کر گیا۔

"تم پھر تم نے مجھے کیوں روکا تھا۔۔۔"

"غلط فہمی ہو گئی تھی"

اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"تو پھر اتار دوں"

میں نے پوچھا

"نہیں آج اپنی کسی ہم جنس سے ہی باتیں ہو جائیں" انداز بے باک تھا۔

میرا اپنا بھی جی یہی چاہ رہا تھا سو گاڑی آہستہ آہستہ چلتی رہی۔

"لیکن تم لوگوں کے تو اپنے علاقے اور ٹھکانے ہیں۔۔۔۔"

جانے کیوں میں اسے طوائف نہ کہہ سکی۔

"ہاں تھے! لیکن ہم بے گھر ہو گئے تو شرفا کی بستیوں میں آن بسے، ویسے بھی ان میں کوئی خاص فرق رہا تو نہیں۔۔۔"

وہ بولی۔

"کیا مطلب۔۔۔"

میں ذرا گڑبڑا کر بولی تو وہ بھرپور انداز میں مسکرائی۔

"آپ عورت کسے کہتے ہیں۔ وہی نا جو جسم و جان اور ناز و ادا کی قیمت وصول کرتی ہو۔ ذرا انصاف سے بتایئے کہ ان بیگمات یا ان افسران کو آپ کیا نام دیں گی جو اونچی محفلوں میں اپنے

جسم کی نمائش کرتی ہیں، اور اونچی سوسائٹی کے آداب کے نام پر غیر مردوں کی بانہوں میں جھولتی ہیں۔ نتیجتاً ان کے باپوں، بھائیوں یا شوہروں کو بڑے بڑے عہدے اور مراعات ملتی ہیں۔''

میرا دماغ سنسناہٹ سے بھر گیا۔

''تم پڑھی لکھی لگتی ہو۔۔۔''

ظاہر ہے وقت کے ساتھ ساتھ شریف زادیوں سے بھی مقابلہ کرنا پڑ گیا ہے نا اور اَب تو لوگ ہر چیز میں A-Class مانگتے ہیں۔ پیٹ اور نوکری کا معاملہ جو ٹھہرا۔''

اس نے مزاقاً کہا مگر چہرے کے خدوخال زہر میں بجھے ہوئے تھے۔

''معلوم ہوتا ہے تم اپنی زندگی سے خوش نہیں ہو۔۔۔ کیوں نہیں عزت کی زندگی کی جانب آ جائیں۔ مَیں نے گھسی پٹی سی نصیحت دہرائی۔

''کون دے گا مجھے عزت کی زندگی؟ آپ کا بھائی؟ آپ کا باپ؟ یا پھر آپ کا شوہر اگر ہے تو؟ میں جانتی ہوں ان مردوں کی اخلاقیات کو گوریاں بیاہ کر لاتے ہیں تو اکڑ اکڑ کر چلتے ہیں۔ گویا کوئی میڈل جیت لائے ہوں۔ Complexed ورنہ گوریوں کے طرز زندگی سے کون واقف نہیں۔''

''یہ تو ان کی بڑائی ہوئی نا۔''

مَیں نے مردوں کی حمایت کی

''ہنہ بڑائی''!

تلخی نے اس کا چہرہ تاریک کر دیا۔

''یہ بڑائی اس وقت کہاں سو جاتی ہے۔ جب اپنی کسی مشرقی لڑکی کی کوئی معصوم سی لغزش جو کسی خط یا فون تک محدود ہوتی ہے انھیں پتہ چلتی ہے۔ پھر تو ان اعلیٰ حضرات کی غیرت کا جوش طلاق سے نیچے ٹھنڈا نہیں ہوتا۔''

بات کو کڑوی۔۔۔ مگر اتنی سچی تھی کہ مجھے یکا یک اس لڑکی پر پیار آ گیا۔ ہم میں تو اتنی جرأت بھی نہیں کہ اس سچ کا اقرار کر سکیں۔ ہم تو

''سب اچھا'' کہہ کر خوش فہمیوں کے لحاف میں منہ چھپائے، خوابوں سے دل بہلاتی رہتی ہیں اور ہمارے مرد، تتلیوں کے رنگوں سے، لیکن میں یہ سب صرف سوچ کر رہ گئی اور میرے منہ سے صرف اتنا نکلا۔

''کھانا کھاؤ گی۔۔۔''

وہ حیرت سے مجھے تکنے لگی پھر مطمئن سی ہو کر بولی

''واقعی بھوک تو لگی ہے، لیکن کسی ایسی اکیلی جگہ جہاں میرا کوئی گاہک مجھے پہچان نہ لے۔''

کیوں بھلا؟ میں واقعی حیران ہو گئی۔

''میرے ساتھ آپ کی بھی سبکی نہ ہو جائے۔۔۔'' وہ مسکرائی۔

میرا جی چاہئے کہ اس پیاری سی لڑکی کو گلے سے لگا لوں۔ مگر معاشرے کے بدنما داغ ایسے ہیں تو ان داغوں کو سینوں پر سجانے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن اتنے فراخ سینے کہاں سے آئیں؟۔۔۔ کھانے کے دوران اس کا ہر انداز شائستہ تھا۔ جانے کیوں میرا جی چاہا کہ اسے اس غلاظت سے باہر کھینچ لاؤں۔

''تم پناہ چاہتی ہو تو میں دے سکتی ہوں اس غلاظت سے نکل آؤ ابھی تو تمھارے سامنے پوری زندگی پڑی ہے''۔۔۔ مَیں نے بے حد پیار سے کہا وہ خلاف توقع بپھر گئی۔

''بیگم صاحبہ اگر اس غلاظت کے ڈرم جا بجا نہ دھرے ہوں تو آپ کے گھر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر بن جائیں گے۔۔۔ غلاظتوں کی بو اتنا تعفن پیدا کر دے گی کہ سانس لینا دشوار ہو جائے گا، اور تمام غلاظت سڑکوں پر بہ نکلے گی۔ آپ دعائیں دیں ان کوڑے کے ڈرموں کو جو آپ کے گھروں کی غلاظت اپنے اندر سمیٹ لیتے ہیں اور آپ کے دامن اور گھر دونوں پاک صاف رہتے ہیں۔۔۔'' مجھے یوں لگا جیسے وہ میرے اور سماج کے منہ پر طمانچے مار رہی ہے۔۔۔ ایک کے بعد دوسرا دوسرے کے بعد تیسرا۔ اس قدر ذہین عورت سے کون مرد دامن بچا سکتا ہے۔ میں نے اپنے دل کے ساتھ سوچا۔ کم از کم یہ اپنی برادری کی تو وفادار ہے نا۔۔۔ ہم مہذب افراد تو اپنے گھروں کے بھی وفادار نہیں۔ تو پھر انسانیت کے مقام پر کون فائز ہے؟۔۔۔ اس سوال کے جواب

سے مَیں نے خود ہی نظریں چرا لیں۔

''مَیں تمھارے دُکھ کو سمجھتی ہوں۔تم چاہو تو میری مدد لے سکتی ہو۔۔۔''

میرے الفاظ میں خلوص تھا۔وہ جھاگ کی مانند بیٹھ گئی۔۔۔آنسو اس کی پلکوں پر لرزنے لگے۔

''کس کا اعتبار کروں کوئی بتائے تو سہی کہ سچ کیا ہے۔اور جھوٹ کیا؟''

''سچ یہ ہے کہ تمھارے اندر معاشرے کے وضع کردہ اچھے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کی خواہش موجود ہے، مگر ایک خوف۔۔۔تمھارے قدم روک رہا ہے بے سائبانی کا خوف۔۔۔مَیں اس پُل صراط سے گزرنے میں تمھاری مدد کروں گی''۔

مَیں ریزہ ریزہ ہو رہی تھی اس کے دُکھ سے۔

''نہیں پُل صراط تو سچ اور جھوٹ کا درمیانی فاصلہ ہے۔جس پر سے آپ مجھے گزارنا چاہتی ہیں''

وہ رُک گئی اور ناخنوں کو دانتوں سے کترنے لگی۔

''آپ کی باعزت زندگی کی طرف لوٹ کر تو میں تمام عمر اس پُل صراط پر چلتی رہوں گی۔ کیوں کہ سچ دوسروں کے لیے جھوٹ اور میرا جھوٹ ہی ان ہی کے لیے سچ ہوگا۔میں ہر سانس ہر لمحہ اس پُل پر معلق رہوں گی۔اس سے بہتر ہے کہ میں اپنے جھوٹ کے ساتھ ہی نباہ کرلوں۔دوئی کا عذاب بہت شدید ہے آپ کہاں سے آگئیں۔میری زندگی کو اتھل پتھل کرنے۔۔۔میرے جذبوں کو ہوا دینے۔۔۔چلی جائیں۔جائیں چلی جائیں''

وہ ہذیانی آواز میں بولی اور پھر سر میز پر رکھ کر رُو دی۔

ہاں میرے بھی خواب ہیں۔۔۔ایک گھر کے خواب ہمکتے بچوں کے خواب تحفظ کے خواب، لیکن کون دے گا ان کو تعبیر۔؟'' وہ دھیرے دھیرے بڑبڑاتی رہی اور روتی رہی۔

مَیں ایک دم Confuse ہو گئی۔دماغ میں جھکڑ سے چلتے رہے۔میں نے ایک فیصلہ کیا آخر۔ایک بے حد خود غرض فیصلہ۔جس کی بنا پر میں تمام ہاری ہوئی بازیاں بھی جیت سکتی تھی اور واہ واہ کے نعرے بھی سمیٹ سکتی تھی۔میری راتیں بھی تو سنسان تھیں۔زر و جواہر کے انبار کے باوجود

جسم و جاں کا خلا محفلوں اور سگریٹ کے دھوئیں سے پُر کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔کیوں کہ میرا معروف شوہر مجھے آسودہ کرنے کی بجائے، نئے نئے لوگوں میں مقبول ہو رہا تھا۔اسے ایک ذہین عورت کی ضرورت ہے جو اسے گھر کا اسیر کرسکے۔یہ سودا مہنگا تو نہیں کہ اگر وہ ہزار ٹکڑوں میں بٹنے کی بجائے۔محض دو ٹکڑوں تک محدود ہو جائے، اور پھر یہ تو میری احسان مند رہے گی تمام عمر کیوں کہ اس کے ساتھ کسی باپ یا بھائی کے عہدے کا لیبل نہیں، جو مجھے ہرا سکے گا۔۔۔میں اپنے مرد کو جانتی ہوں اب کی بار جیت میری ہوگی۔

مَیں نے بے حد آسودہ مسکراہٹ کے ساتھ اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا۔

''اٹھو گھر چلیں''

''کون سے گھر؟''

وہ بوکھلا گئی

''میرے گھر''

''میرے شوہر کی دلہن بنوگی؟''

☆☆☆

محبت والی کھڑکی

صبح ہوتے ہی اس کا چہرہ انیکسی کی جانب کھلنے والے چھوٹے دروازے میں نظر آتا---بکھرے بالوں، میلے کپڑوں اور بھدے پاؤں میں سستے سے چپل گھسیٹتی وہ پہنچ جاتی ہے؟---دودھ پیے گی یالسی دادی بے چاری دل کی ہاتھوں مجبور ہو کر کہتیں، مگر پھوپھی کے ماتھے کے بل اور کزنز کی طنزیہ مسکراہٹیں اسے پسپائی پر مجبور کر دیتیں---

''بس جاتی ہوں ماں جی---ناشتہ بھی بنانا ہے---''اور جنت کی جانب کھلنے والا در بند کر کے اپنے جہنم میں آپس چلی جاتی۔ سنا ہے کہ بچپن میں اچھا خاصا ناک نقشہ تھا مگر اس پر وہ کہاوت الٹ ہوگئی کہ جوانی میں گدھی پر بھی روپ آتا ہے۔ وہ جوں جوں بڑی ہوتی گئی توں توں پھیلتی گئی---تنبو کی طرح---بے ہنگم اور بے ڈول سیاہی مائل گہرا سانولا رنگ اور چربی کی تہوں میں رکھے نقوش پھوہڑپنے کا مارا ستا سالباس اور اوٹ پٹانگ سے رنگ--ہاں جو چیز اس کی جانب دیکھنے پر مجبور کر دیتی---وہ تھی اس کی مسکراہٹ معصومیت میں گندھی ہوئی---ننھے سے دہانے کے بیچ سفید دانت---بولتی تو لگتا گنگنا رہی ہو---میٹھی نرم آواز جیسے کسی بنجر پہاڑ کے بیچوں بیچ ٹھنڈے پانی کا جھرنا بہہ رہا ہو۔

ایک دوسرے سے بے زار---دو مختلف دنیاؤں کے باسی، ماں باپ کی ایک دوسرے

سے نفرت کی تمام ترسیاہی اس کے وجود میں سمٹ آئی تھی۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ آپس کی نفرت واقعی بدصورت بچوں کو جنم دیتی ہے۔ جاہل ان پڑھ پھوہڑ بیوی کو ایم اے پاس خاوند قبول نہ کر سکا۔ خاموش طبع گھٹی ہوئی عورت نے زندگی کی حقیقتوں سے نظریں چرالیں اور نسوار کے نشے میں احتجاج کا لبادہ اوڑھ کر بیٹھ گئی---خاوند نے دور دراز مقام پر نوکری ڈھونڈلی سال دو سال میں ایک ملاقات ایک نیا وجود زمین پر لے آتی---ان جیتے جاگتے لوتھڑوں کے کچھ بشری تقاضے بھی تھے، جو بھی طرح پورے کرنا ان دونوں کے بس میں نہ تھا سو وہ سب خود ہی ہاتھ پاؤں مارتے لڑتے جھگڑتے بڑے ہوتے گئے۔

مانو سب سے بڑی تھی سو بچپن میں ہی ماں بن گئی۔ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی نشئی ماں کی صلواتیں سننا، بچے پالنا، گھر سنبھالنا سب کچھ غیر ارادی طور پر ہی اس کے ذمے ہوگیا---یا اس نے خود ہی یہ Role اپنا لیا کہ اس پہاڑ سے وجود میں ایک ننھی سی گلہری کا نازک سا دل دکھوں کی چادر سمیٹ کر اس نے ایک سائبان بنالیا، جس کے تلے وہ ننھے ننھے سات وجود سنبھال کر بیٹھ گئی۔ ان کے دکھ سکھ اس کے وجود کا حصہ بن گئے۔ کبھی کبھار جھلک دکھانے والے باپ کو یوں مودب ہو کر ملتی جیسے اس زندگی کے لیے وہ اس کی احسان مند ہو۔ وہ بے حس انسان بھی چند لمحوں کے لیے چور سا بن جاتا---مانو کی خدمت گزاری تازیانہ بن کر اس کی روح پر برسنے لگتی تو وہ چھٹی ختم ہونے سے قبل ہی بھاگ جاتا کہ پھولوں کی چھڑی کی مار سہنا اس جیسے بزدل کے بس کی بات نہ تھی---مانو کی زندگی سیدھی بڑھاپے میں پہنچ گئی۔ کالج سے پسینے میں شرابور پیدل واپس آنا---گھر کے دھندے نپٹانا چھوٹے بھائیوں، بہنوں کی پڑھائی کا دردسر پھوپی جان کے گھر کا چکر لگانا چند گھڑی دادی کو دبانا---کسی کا ہاتھ بٹانا یہ سب کچھ اس کی قید بامشقت کا حصہ تھا---یہ اور بات ہے کہ وہ یہ سب کچھ ایسے کرتی جیسے وہ پیدا ہی ان کاموں کے لیے ہوئی تھی زندگی کا شاید کوئی قرض چکانا ہوگا کسی جنم میں---اس کی طمانیت دیکھنے والوں کو بے چین کر دیتی، مگر اس کا مسکراتا معصوم گول گوتھنا سا چہرہ اندر کتنے طوفان چھپائے ہوتا تھا۔ یہ تو تب پتہ چلتا، جب وہ اپنے ''گوشہ عافیت'' میں بند ہو جاتی یہ ایک سٹور تھا جہاں کاٹھ کباڑ، پیٹیاں اور پیٹیوں پر

گدوں اور رضائیوں کا ڈھیر دھرا رہتا۔ وہ اسی ڈھیر کا ایک حصہ بن جاتی حتیٰ کہ شدید گرمیوں میں بھی بغیر پنکھے کے پسینے سے نچڑتا بدن لیے وہ رضائیوں کے ڈھیر پر پڑی رہتی شاید اپنے دکھتے بدن اور زخمی روح پر پھاہا رکھنے کی خواہش اسے روئی کے انبار کی جانب کھینچ لاتی۔۔۔ آڑی ترچھی لیٹی وہ یہاں خواتین کے رومانوی ناول اور رسالے پڑھا کرتی، ایک طلسمی دروازہ کھل جاتا وہ دبے پاؤں ہر دکھ کی گرفت سے آزاد اپنے من کی ملکہ بن جاتی۔۔۔ ایک خوبصورت چاہنے والے کے ساتھ کسی آنگن میں ہنستی ناچتی رہتی۔۔۔ حتیٰ کہ کسی ذمہ داری کا سخت ہاتھ اسے کھینچ لیتا۔ وہ بے بسی سے چلاتی ہاتھ پاؤں مارتی مگر طلسمی دروازہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ کبھی کبھار وہ دیوار پر لگے دھبوں سے اٹے چھوٹے سے آئینے میں خود کو دیکھا کرتی۔۔۔ مختلف فاصلوں سے مختلف زاویوں سے۔۔۔ مگر آئینہ تو سچ ہی بولتا ہے۔ نا! جھوٹی کہانیوں سے دل بہلاتے بہلاتے اس پر انکشاف ہوا کہ اس کے تصوراتی شہزادے کے نقوش واضح ہونے لگے ہیں۔ اظہر۔۔۔ پھوپھی کا اکلوتا بیٹا جس کے حسن کے چرچے عام تھے وہ اس زیادتی پر چلا اٹھی خدا سے فریاد کی۔۔۔ خواہش بھی دی تو کیسی؟ کتنی انہونی! کچھ تو دیکھا ہوتا۔۔۔ کوئی قدر تو مشترک ہوتی۔۔۔ مگر دل تھا کہ ایک ہی تال پر گاتا رہا وہ روز جیتی روز مرتی رہی۔ یک طرفہ کھیل تھا جس میں وہ خود ہی تماشا اور خود ہی تماشائی تھی۔۔۔ اتنے بڑے پہاڑ سے بے ہنگم وجود میں شیشے کی موجودگی کا علم کسے ہوتا بھلا! اظہر کی شادی میں بھاگ بھاگ کر کام کرنے والی عورت نما لڑکی کے دل تو کیا وجود کی طرف کسی کا دھیان نہ گیا۔ اسے پہلی مرتبہ اپنے بے ڈول ہونے پر خوشی ہوئی۔۔۔ ورنہ چند ہی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کا اگر کوئی نوٹس لے لیتا تو۔۔۔؟ پڑھائی ختم ہو چکی، بچے سکول چلے جاتے نشئی ماں کے چہرے سے مکھیاں اُڑاتے اُڑاتے وہ یونہی بے دھیانی میں آسمان کی طرف دیکھنے لگ جاتی۔۔۔ مَیں کس کی بیٹھی ہوں کہاں کھو گئے میرا بچپن میری جوانی!

شاید کوئی شبھ لمحہ تھا جب اس کی خاموش فریاد نے آسمانوں پر دستک دی اس مرتبہ باپ گھر آیا تو مانو کی شادی کا عزم لے کر۔۔۔ وہ جو تمام روشنیوں سے منہ موڑے بیٹھی تھی۔۔۔ دیے کی لو سے چندھیا گئی چھوٹے سے آنگن کا تصور جہاں نہ نشئی ماں کا دکھ دیتا وجود ہو اور نہ بے حس باپ کا انتظار

مگر۔۔۔ یہ ننھے ننھے وجود؟ اس کی مامتا تڑپ اٹھی ہمیشہ کی طرح وہ اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گی۔۔۔ اس کا اندھیرا وجود چمکتے کپڑوں میں چھپا دیا گیا اور وہ جو کبھی نہ روئی تھی۔۔۔ جنم جنم کے آنسو لٹانے لگی۔۔۔

ادھیڑ عمر سعید خوابوں کا شہزادہ نہ تھا اور وہ تھی حقیقت پسند۔۔۔ سو سعید کا وجود ایک پناہ گاہ بن گیا۔ سیدھا سادا بندہ اس کی خزاں رسیدہ زندگی کو ہرا کرنے لگا۔۔۔ پیاسا وجود ایک اسفنج بن گیا۔۔۔ وہ پوری طرح سیراب بھی نہ ہو پائی تھی کہ بادل سر سے سرکنے لگا سعید کا تبادلہ دوسرے شہر ہو گیا رہائش کا مسئلہ تھا۔۔۔ سعید اسے گاؤں چھوڑ گیا۔۔۔ چار پائی پر بیٹھی ساس، دیوروں نندوں کا ہجوم۔۔۔ دن بھر چولہا چوکی، تیمار داریاں، لگا وہ پھر میکے آ گئی ہے، مگر وہ عادی تو تھی۔۔۔ سو لگی رہی۔۔۔ سعید کے ساتھ گزرے دن اسے گنگنانے پر مجبور کر دیتے، کوئل جیسی میٹھی آواز، نندوں کو اس کے پاس کھینچ لاتی سعید گھر آتا تو چھوٹے موٹے تحائف مونو کی تھکن اتار دیتے۔۔۔ مگر ساس کو اس کا سعید کے پاس بیٹھنا اچھا نہ لگتا۔۔۔ ڈانٹ پھٹکار میں بے اولادی کا طعنہ بھی زہر گھولنے لگا ''جڑ جڑ کر بیٹھی تو رہتی ہے میاں کے ساتھ۔۔۔ رہی پھر بھی بنجر کی بنجر''۔۔۔ ساس کے ننگے فقرے گلہری سی مانو کا دل زخمی کرنے لگے۔۔۔ زمین و آسمان کی سازش رنگ لائی۔ رانی لال جوڑے میں سعید کی دلہن بن کر آ گئی۔۔۔

''مانو بیٹا چل اپنے گھر۔۔۔ تجھے کیا ضرورت ہے دوسروں کو کما کر کھلانے کی۔۔۔ وہ بے غیرت تیری کمائی پر منہ کالا کرتا پھر رہا ہے''۔۔۔ باپ کا دبلا پتلا وجود غصے سے کانپ رہا تھا وہ چپ چاپ کھڑی رہی۔ ''سوچ کیا رہی ہے۔ اٹھا اپنا سامان۔۔۔''

مانو کو لگا جیسے قدموں تلے زمین کھسک رہی ہے۔ چھت کا ملبہ ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہا ہے۔۔۔ اندر باہر شور بڑھنے لگا اس کا دماغ دھماکوں کی زد میں آ گیا۔۔۔ یک دم ہی وہ چیخ پڑی۔ ایک جھٹکے سے اس نے اپنا بازو باپ سے چھڑایا۔۔۔ ''چلے جائیں آپ چلے جائیں کیوں آ جاتے ہیں بار بار۔۔۔ میری دنیا برباد کرنے یہ میرا گھر ہے صرف میرا۔۔۔ سب جھوٹ بولتے ہیں شوکت میرا ہے یہ گھر میرا ہے۔۔۔ مت چھینیں اسے مجھ سے۔۔۔ چلے جائیں۔۔۔ جائیں چلے جائیں۔

روتی بلکتی وہ کمرے کی دہلیز پر بیٹھ گئی مانو کا یہ انداز باپ کے لیے نیا تھا۔۔۔ یہ رُوپ تو اس نے آج دیکھا تھا پتھروں کو روتے۔۔۔ مٹی کو سسکتے اس نے آج سنا تھا گھر کی دہلیز پر کھڑا شوکت وہیں جم کر رہ گیا۔ کتنا دکھ۔۔۔ کتنا سوز تھا اس پکار میں۔۔۔ اس فریاد میں۔۔۔ اور کتنا مان تھا۔۔۔ ایک عورت اپنے گھر کو سمیٹے رکھنا چاہتی تھی خود کو جھٹلا کر خود کو گنوا کر بھی۔۔۔ شوکت نے خود کو بے حد چھوٹا محسوس کیا اتنا چھوٹا کہ خود اپنی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔۔۔ گونگی ساعتیں ان کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑی ہو گئیں شوکت نے آگے بڑھ کر اس حلقے کو توڑا "ابو آپ گھر جائیں۔۔۔ مانو کا گھر اب کبھی نہیں اجڑے گا۔۔۔ یہ گھر اس کا ہے اور اسی کا رہے گا۔ مانو اب میرے ہاتھ کا کمایا ہوا کھائے گی۔۔۔ یہ میرا وعدہ ہے۔۔۔ جائیں ابو آپ جائیں" یہ کہتے کہتے شوکت کا گلا رندھ گیا۔۔۔

کمرے کی دہلیز پر بیٹھی سسکتی تڑپتی مانو نے بے یقینی سے سر اٹھایا شوکت کی آنکھوں میں جھانکا۔ اسے پہلی مرتبہ ادراک ہوا کہ محبت والی کھڑکی آج سچ مچ اس کی زندگی کی جانب کھل گئی ہے۔

☆☆☆

گم نام لفافہ

وہ بے دھیانی میں چلتے ہوئے کبھی کبھی پاس سے گزر جانے والی کاروں کو یوں دیکھتا ہے جیسے کسی خوشیوں سے بھری گٹھڑی کا منتظر ہو۔۔۔۔۔ کوئی ایسی گٹھڑی جس میں اپنی ضرورت سے زائد خوشیاں کوئی باندھ کر پھینک جائے اللہ واسطے! تا کہ اسے وہ لوگ اٹھا لیں جن کی بوجھل گٹھڑیوں میں محرومیاں، تشنہ آرزوئیں اور بھوک کلبلا رہی ہے "کتنا پاگل ہوں مَیں"۔۔۔ وہ سوچتا ہے۔ بھلا خوشیوں کی گٹھڑی بھی کبھی کسی کو بھاری لگی ہے جو کوئی یوں راستے میں پھینک جائے۔۔۔ خوشیوں کی گٹھڑیاں تو غبارے جیسی ہوتی ہیں پھولتی جاتی ہیں، جوں جوں پھولتی جاتی ہیں توں آدمی کو اوپر ہی اوپر ہواؤں میں اڑاتی جاتی ہیں۔۔۔ دور۔۔۔ جہاں سے ہر منظر بھلا لگتا ہے۔ بوجھل تو ہوتی ہیں دُکھوں کی گٹھڑیاں جنھیں اٹھاتے اٹھاتے جسم جھکنے لگتے ہیں۔۔۔ کمریں خمیدہ ہو جاتی ہیں اور بالآخر زمین پر رینگنے والوں کو زمین نگل جاتی ہے۔

اس کا منہ کڑواہٹ سے بھر جاتا ہے۔۔۔ وہ چرس بھرے سگریٹ کا کش لگا کر جیسے ساری دنیا کو ایک گالی دیتا ہے۔۔۔ اور خود کو ہلکا پھلکا کر لیتا ہے۔ ابھی اس نے دُنیا میں دیکھا ہی کیا ہے؟۔۔۔ مگر وقت نے اس کو اتنی چھوٹی سی عمر میں ہی اتنا پکا کر دیا ہے کہ وہ کسی ساٹھ سالہ بڈھے کی طرح سوچتا گیا ہے۔۔۔ زندگی کی اوڑھنی کے سارے کچے رنگ، تلخیوں کی دُھوپ میں ایک

ایک کر کے اڑتے چلے گئے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ اوڑھنی اصل میں بے رنگ و بے مایہ ہے۔۔۔ یہ رنگ یہ لہریں یہ چمک سب کچھ لمحاتی ہے۔ سو وہ مطمئن بھی ہے اور غیر مطمئن بھی۔

چاہے کچھ دیر کے لیے ہی سہی ان رنگوں پر کچھ دیر کے لیے اس کا حق تو بنتا ہے نا۔۔۔ سو وہ مضطرب بھی ہو جاتا ہے۔ سوچ کر جہنم سے بھاگنے کا اس نے ایک راستہ ڈھونڈ تو رکھا ہے۔۔۔ مگر ہر بار وہ پلٹ کر آتا ہے تو تپش دو چند ہو جاتی ہے۔۔۔ سو وہ جلتا بجھتا رہتا ہے۔۔۔ اپنے سگریٹ کی طرح۔

جانے کہاں سے لہروں پر اڑتی ایک نسوانی آواز سنائی دیتی ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ کسی سے ٹکرایا ہے۔۔۔ پھر وہ جیسے واقعی اندھا ہو جاتا ہے بس اس کی سماعت زندہ رہ جاتی ہے۔ اس کی پور پور سننے لگتی ہے۔ ساری دنیا پس منظر میں چلی جاتی ہے۔۔۔ آواز کا شعلہ اسے خاکستر کیے دیتا ہے۔۔۔ وہ آواز والی کی پیچھے چل پڑتا ہے جانے دن گزرتے ہیں۔ مہینے یا سال۔۔۔ اسے کچھ یاد نہیں وہ تو آواز کی انگلی تھامے سڑکوں پر پھرتا ہے۔ اور اور۔۔۔ ایسے لگتا ہے جیسے آواز کے سحر نے اس کے پرانے درد جگا دیے ہیں۔ محرومیاں تشنہ خواہشیں سب ننھے منے بچوں کی طرح کونوں کھدروں سے نکل کر اس کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑی ہو گئی ہیں۔ جانے آواز والی کے وجود میں کون سی ایسی کشش ہے کہ وہ سب کچھ بھول سا گیا ہے۔

''کیا کوئی معجزہ نہیں ہو سکتا تم اپنے مدار سے نکل آؤ یا میں ٹوٹ کر کہیں کھو جاؤں اور گھومتا گھومتا تمھارے مدار میں داخل ہو جاؤں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔۔۔''

''ہم'' جیسے لوگوں کے ساتھ معجزے نہیں ہوا کرتے اس لیے کہ ہم خاص لوگ ہیں۔ ہم خود ایک معجزہ ہیں اور معجزوں کے ساتھ معجزے نہیں ہوا کرتے'' وہ مسکراتی ہے۔

''معجزے ان کے ساتھ ہوتے ہیں جو عقل اور شعور کی بجائے شعبدہ بازی کے زور پر چیزوں کو تسلیم کرتے ہیں۔ یہ خوف کی پیداوار ہوتے ہیں اور خوف میں ہی زندہ رہتے ہیں۔ سو ایسے لوگوں کو Tame کرنے کے لیے ان دیکھی، پراسرار، پرہیبت چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے''۔

وہ اپنی سحر انگیز باتوں سے اسے حیران کیے جاتی ہے، اور وہ حیرانی کے صحرا میں بوند بوند پانی

کے لیے بھاگا پھرتا ہے۔

''میرا جی چاہتا ہے کہ تمھاری گود میں سر رکھ کر سو جاؤں۔ ایک ایسی نیند جو سمندر جیسی ہو۔ گہری پرسکون اور شاید کبھی نہ ختم ہونے والی۔ وہ بچوں کی طرح مچل جاتا ہے'' تمھیں ابھی بہت دور تک جانا ہے۔ سو جاؤ گے تو مسافت کی کڑی دھوپ کا سامنا کرنے کے قابل نہ رہو گے۔ تمھارا بدن لجلجا ہو جائے گا۔ سوچیں زنگ آلود ہوں گی اور پاؤں کے تلوے نرم و نازک ہو جائیں گے۔ اپنی تلاش کا سفر تو بہت کٹھن ہے۔ زخمی تلوں کی خبر لینے دیتا ہے اور نہ دراڑوں سے اٹے بدن کی'' وہ اپنی ذات کے دشت سے ابھر کر اسے سمجھاتی ہے۔

''مگر رُوح کی تھکن کے بارے میں تو تم نے بتایا ہی نہیں میری تو رُوح بھی تھک چکی ہے''۔ وہ جھنجھلا جاتا ہے۔ ''تمھاری رُوح اس لیے نڈھال ہے خود آگہی کا سفر ابھی شروع نہیں ہوا۔ یہی تو مزہ ہے۔ اس سفر کے آغاز کے ساتھ ہی رُوح تر و تازہ ہوتی جائے گی۔ اندر کے سب بھید عیاں ہوتے چل جائیں گے۔ یہ جسم تو بس ایک میڈیم ہے۔'' اس کی چمکتی شعاعیں منعکس کرتی '' آنکھوں کی وہ دیر تک تاب نہیں لا سکتا۔

وہ اسے اپنے سحر کا اسیر کر کے چلی جاتی ہے۔۔۔ اسے آواز والی پر غصہ آتا ہے بے تحاشہ اس کا جی چاہتا ہے کہ اسے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالے۔ اس کے بدن پر اپنی شدتوں کے نشان ثبت کر ڈالے اور چیخ چیخ کر کہے ''میں نہیں مانتا تمھارے ان بوگس رُوحانی فلسفوں کو یہ سب بکواس ہے مجھے تمھاری ضرورت ہے تمھارے وجود کی ضرورت ہے'' ۔۔۔ وہ خود میں جلتا بجھتا رہتا ہے۔ شعلے کی مانند بھڑکتا رہتا ہے۔ مگر جونہی اس کی آواز سنتا ہے ٹھنڈا ٹھار ہو کر سحر زدہ سا اس کی آواز کی انگلی تھامے انجانی گھاٹیوں، پراسرار رستوں اور ٹمٹماتی روشنیوں کی جانب چل پڑتا ہے۔۔۔ حتیٰ کہ وہ رخصت ہو جاتی ہے۔ اسے ہر بار ایک نئے سوال کے جہنم میں چھوڑ کر۔۔۔

وہ اپنی بزدلی پر روتا ہے، چلاتا ہے، خود کو اذیت دیتا ہے۔ مگر ایسا کیوں ہوتا ہے ہر بار وہ وہ چاہتا ہے آواز والی کی شبیہ ذہن میں لانے کی کوشش کرتا ہے مگر یہ کیا؟ اسے تو ابھی تک یہ معلوم نہیں کہ وہ کیسی ہے؟ گوری ہے یا کالی خوبصورت یا بدصورت؟ فگر کیسا ہے؟ قامت کیسی ہے؟ وہ

سر تھام لیتا ہے۔ ''یہ کیسا عذاب ہے۔ میرا ذہن اسی کے کا احاطہ کیوں نہیں کر پاتا۔۔۔ شاید اس کی آنکھوں سے پھوٹنے والی روشنی اتنی زیادہ ہے کہ اس کا وجود دُھندلا جاتا ہے۔ اس کے جسم کی نفی ہو جاتی ہے۔'' ایک دن دیکھا سا ہالہ اسے اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے اور وہ خود اوجھل ہو جاتی ہے۔ اس کا دوست اسے حیرت سے دیکھتا ہے۔ ''یار کتنی عجیب بات ہے تم اس کے لیے پاگل ہوتے جا رہے ہو اور تمھیں اس کی شکل کے بارے میں کچھ علم نہیں۔'' دوست کی آ اسے حیرت سے دیکھتا ہے۔ ''یار کتنی عجیب بات ہے تم اس کے لیے پاگل ہوئے جا رہے ہو اور تمھیں اس کی شکل کے بارے میں کچھ علم نہیں۔'' دوست کی آنکھوں میں شک کروٹیں لے رہا ہے۔ ''یقین کرو وہ موجود ہے اس کی خوشبو مجھے ہر لمحہ گھیرے میں لیے رکھتی ہے، مگر وہ کیسی ہے؟ یقین کرو میں نہیں جانتا'' وہ بے بس سا ہو کر سر گھٹنوں میں دے لیتا ہے۔

کہیں میں آسیب زدہ تو نہیں ہو گیا۔ کہیں میری محرومیوں نے کوئی نیا پاکھنڈ تو نہیں رچا لیا۔

وہ خود اپنے بارے میں مشکوک ہونے لگتا ہے۔ اب وہ ڈوری کے ایک سرے پر بیٹھا دوسرے سرے کو ڈھونڈتا رہتا ہے وہ بھول جاتا ہے کہ اس کا بدن ٹوٹ رہا ہے۔۔۔ اسے چرس کے کش کی طلب ہے یا کسی سے لڑنے بھڑنے کی۔ اسے احساس ہونے لگتا ہے کہ محبت تو ضرورت بن سکتی ہے، مگر محض ضرورت کبھی محبت کا رُوپ نہیں دھار سکتی۔۔۔ اور پھر وہ آ جاتی ہے۔ نتھری نتھری اُجلی اُجلی۔۔۔ لہجے کا شہد ٹپکاتی وہ کسی ندیدے بھوکے بچے کی مانند اس کی اُنگلی سے ٹپکتا قطرہ قطرہ شہد چاٹتا پھر اس کے پیچھے پڑتا ہے۔

وہ چاہتی ہے کہ وہ دُنیا کے چمکیلے رنگ بھی دیکھے صرف اندھیروں میں نہ ڈوبا رہے، مگر وہ تو اس کی نگاہوں کی شعاعوں میں ہی بھیگنے پر بضد ہے۔ وہ اسے ان سنے بین بھی سنانا چاہتی ہے۔ مگر کھنکتی ہنسی کی جھنکار سے بھی محروم نہیں رکھنا چاہتی۔ ان دکھا دکھانا چاہتی ہے۔ تڑختے نقابوں کے پیچھے چھپی مکروہ صورتیں بھی اسے دیکھنے پر مجبور کرتی ہے۔

''خالی کھوکھلے الفاظ جو تمھارے گرداگرد بدرُوحوں کی طرح گھیرا ڈالے ناچتے ہیں۔ مَیں تمھیں ان کے حصار سے نکالنا چاہتی ہوں۔ میرے ساتھ چلو۔ عمل کے خارزاروں میں۔۔۔ مگر یقین مانو دور کہیں ایک بے حد خوبصورت دُنیا تمھارا انتظار کر رہی ہے۔'' اس کی سرگوشیاں اس کے دکھتے وجود کو تھپکنے لگتی ہیں مگر دوسری جانب خالی ڈھول جیسے الفاظ بجنے لگتے ہیں۔۔۔ شور کرتے ہیں اس کے اعصاب چیخنے لگتے ہیں اور کسی بنجر ٹنڈ منڈ جھاڑی کی طرح خود کو آندھیوں کے بعد کے اتھاہ سکوت کے حوالے کر دیتا ہے۔۔۔ پھر وہ چھا جاتی ہے۔ جس کی سرگوشیاں پھول بن کر چٹکنے لگتی ہیں۔ اس کا بنجر جسم پھولوں سے ڈھک جاتا ہے۔ زرخیز ہونے لگتا ہے وہ خوشبو اوڑھ کر سو جاتا ہے۔۔۔

اب اسے آتی جاتی کاروں سے جھانکتے چہروں سے نفرت محسوس نہیں ہوتی۔ اسے خوشیوں سے بھری کسی گٹھڑی کا اب انتظار نہیں رہتا۔۔۔ وہ بھول جاتا ہے کہ اس کے ہاتھ میں بی اے کی ڈگری اور پاؤں میں پھٹے چپل ہیں۔ اسے ان تلخ تھپڑوں کا ذائقہ بھی بھول گیا ہے جو اس کے باپ نے نئی شادی کے نشے میں اس کے اور اسے کی ماں کے منہ پر لگائے تھے۔ اسے وہ سارے دن رات بھول گئے ہیں، جب وہ ٹھٹھرتی راتوں میں ننگا اور لمبی دوپہروں میں بھوکا سوتا تھا۔۔۔ اسے تو یہ بھی یاد نہیں کہ اس کے جسم کی سوئیاں چنتے چنتے خود سولی پر ٹنگی رہنے والی ماں جب ہسپتال کے یخ بستہ برآمدے میں پڑی تھی تو اس کے بے جان جسم پر ایک پتلی سی اوڑھنی تھی۔۔۔ اور تو اور اسے وہ قسم بھی نہ یاد رہی کہ وہ تمام زمانے سے انتقام لے گا۔۔۔ ایک ایک اذیّت کا ایک ایک سسکتے لمحے کا۔۔۔ مگر وہ کچھ بھی تو نہ کر سکا تھا۔ سوائے خود کو جلانے کے۔۔۔ چرس کے دُھوئیں مَیں اپنے وجود کی نفی کرنے کے۔۔۔ اور اب یہ آ گئی ہے اسے سب کچھ بھلانے کو یا شاید اس کی محرومیوں کو دوچند کرنے کو۔

اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ چرس کی طلب کبھی تنگ کرتی بھی ہے تو پیسے کہاں سے آئیں۔ سو وہ چپ چاپ رہ جاتا ہے یا آواز والی کی اُنگلی تھامے ادھر اُدھر گھومتا رہتا ہے۔ وہ تو سرزنش کرتی ہے ''اور وہ ٹھہرا اسدا کا بزدل اس کی نظروں میں گرنے سے ڈرتا ہے۔

اس کا میلا کچیلا سا کمرہ مزید میلا ہوتا جا رہا ہے۔ وہ آتی ہے تو اسے خوب خوب سناتی ہے۔ [illegible] ترتیب سے رکھتی ہے۔ کپڑے بدلنے پر اصرار کرتی ہے۔ بڑبڑاتی جاتی ہے اور ساتھ ساتھ اس کے لیے کھانا بناتی جاتی ہے۔ دوائیں پلاتی، پھل کھلاتی چائے بنا کر گھنٹوں باتیں کرتی اور پھر

چلی جاتی ہے۔ وہ تکتا رہتا ہے۔ چاہتا ہے کہ اسے روک لے ہمیشہ کے لیے مگر روک نہیں پاتا۔۔۔

اس کی عدم موجودگی میں سب کچھ پھر سے الٹ پلٹ کر دیتا ہے۔ جان بوجھ کر! کبھی کبھی تو اس کا جی چاہتا ہے کہ اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دے کسی ایسے کھلونے کی طرح، جو اس کی دسترس سے باہر خوبصورت سے شوکیس میں سجا اس کی خواہش کا مذاق اڑا رہا ہو۔ اکیلے میں وہ بے حد خوفناک منصوبے بناتا رہتا ہے۔ اسے زیر کرنے کے لیے اپنی جبلّت کی تسکین کے لیے مگر جونہی وہ آتی ہے۔ سب کچھ بھول بھال کر نڈھال سا ایک جانب بیٹھ جاتا ہے۔ اس کی سوچیں آوارہ ہوتی جارہی ہیں۔ وہ اپنے جذبوں کے آگے بند باندھتے تھک سا گیا ہے۔

ہلکا ہلکا سا تعفّن کہیں سے ابھر رہا ہے۔ اردگرد پھیلی مستقل سڑاند کے باعث قوت شامعہ بے حس ہو چکی ہے، مگر پھر بھی کہیں کچھ ہے جو محسوس ہو رہا ہے۔ لوگ چونک پڑے ہیں۔ کیا ہے کہاں ہے؟ کچھ تو ہے؟ جو بھی ہے کیا ہے؟ سوال ابھر رہے ہیں۔

دوسروں کی بو جلد ہی پا لینے والے آخر کوارٹر نمبر چار تک پہنچ جاتے ہیں۔ معتبر افراد کی موجودگی میں دروازہ توڑا جاتا ہے۔ تو ایک سکڑا سمٹا میلا کچیلا جسم بے ترتیب کمرے میں ان کا استقبال کرتا ہے۔۔۔ وہ اپنی پہلی اور آخری پناہ گاہ افلاس کی گود میں یوں پڑا ہے، جیسے یہی تو بس حاصل زیست ہے۔۔۔ دیکھنے والوں کو عجیب سا لگا کہ مرنے والے نے بے حد مضبوطی کے ساتھ ایک تکیے کو جکڑ رکھا ہے۔ جس کا غلاف اور روئی جگہ جگہ سے یوں ادھڑے ہوئے ہیں، جیسے کسی جانور نے اسے اپنے پنجوں سے خوب نوچا ہو۔۔۔ کھسوٹا ہو۔۔۔ ناک سے بہنے والی ایک پتلی سی سرخ لکیر نے اس کے ہلکے تمسخرانہ انداز میں پھیلے ہوئے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی سرخ مہر لگا دی ہے۔۔۔ اس گمنام لفافے کی طرح جو جانے کتنے ہی در کھٹکھٹانے کے بعد ڈاکیہ واپس GPO میں لے آیا ہو۔

☆☆☆

اب منصف میں ہوں

نیم غنودگی کے عالم میں اس نے ''دھم'' کی آواز سنی یوں لگا، جیسے کوئی ہولے سے صحن میں کودا ہو۔ رحمے نے اٹھنے کی کوشش تو کی مگر نیم دلی سے۔۔۔ دن بھر گارے اور سیمنٹ کے ساتھ نبرد آزما رہنے کے بعد ویسے بھی اس کا جسم اب کسی بھی قسم کی حرکت سے انکاری تھا۔ وہ دوبارہ اونگھ سا گیا۔

یوں تو فجر کی نماز اس کا معمول تھی چاہے رات کو دیر سے سوئے یا جلدی عین نماز کے وقت اسے جیسے کوئی جھنجھوڑ کر جگا دیتا تھا۔۔۔ اپنا صاف کُرتا اور تہبند، تکیے کے نیچے سے نکال کر پہنتا اور سیدھا مسجد پہنچ جاتا، نماز سے فارغ ہو کر جانے کیوں وہ تھوڑی دیر تک وہیں صف پر گھٹنے سمیٹے چپ چاپ بیٹھا رہتا جیسے کسی گتھی کو سلجھا رہا ہو کسی سوال کا جواب مانگ رہا ہو جانے کب سے؟ اور کس سے؟؟

کئی مرتبہ مولوی فضل اسے چونکا دیتے، رحمے اٹھ پتر آج کام پر نہیں جانا تجھے؟۔۔۔ ''ہاں ہاں مولوی جی''

وہ گڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا اور مولی فضل اپنی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکرا پڑے ''ہاں [illegible] ہو ہوا نہ بال بچے نہ آگا نہ پیچھا'' اور ساتھ ہی اُنھیں اپنے بیوی بچوں کی یاد ستانے لگی۔۔۔ وہ بے چارے گاؤں سے یہاں قصبے کی مسجد آباد کرنے چلے آئے تھے کہ گاؤں کی مسجد میں

بھی زمین دار کی آشیر وباد خدا کی مرضی سے زیادہ ضروری تھی۔

رحیما جلدی جلدی اپنے گھر کی جانب لپکتا۔ رس کے چیونٹے چڑھے چند ٹکڑے یا رات کی باسی روٹی، جس میں سے وہ چن چن کر چیونٹے اتارتا۔۔۔ اُنھیں پیار سے پرے رکھ دیتا اور پھر چائے کے ساتھ روٹی کو حلق سے نیچے اتارتا۔۔۔ ساتھ ہی ساتھ وہ چیونٹوں کی بے چینی پر بھی مسکراتا، جو تھوڑی دیر تک تو روٹی کی خوشبو کے اسیر ایک دائرے میں گھومتے رہتے اور مایوس ہو کر کسی اور جانب سفر کر جاتے۔ رحیما بھی انھی کی طرح ناک کی سیدھ میں ایک ڈگر پر چل پڑتا۔ دن بھر کی محنت مزدوری کے بعد جمع دیہاڑی ملتی وہ اکیلی جان کی محدود ضروریات کے لیے کافی تھی۔ نہ کوئی بڑا غم نہ کوئی بڑی خوشی۔ ہاں کبھی کبھی وہ اپنے پیدا ہونے کے مقاصد اور اسباب پر غور کرتا، مگر کوئی نتیجہ نہ برآمد ہونے پر وہ اپنا دھیان کہیں اور لگانے کی کوشش کرتا۔

شام کو اکثر کچی آبادی کے مزدور تندور یا شیدے کوچوان کے اڈے پر اکٹھے ہو کر بیڑیوں کے کش لگاتے۔۔۔ پنجابی گانوں کی کیسٹیس با آواز بلند لہک لہک کر سنتے۔ ٹھٹھا مذاق کرتے اور چند لمحے کے لیے مسائل کو بھول جاتے اور رات کو دکھوں کی پیوند بھری چادر اوڑھ کر سو جاتے، مگر رحیما تو نرالی مٹی سے گوندھا گیا تھا۔ اوّل تو وہ ایسی بیٹھکوں سے دور بھاگتا۔ جو کبھی ساتھی سنگی پکڑے کر لے بھی جاتے تو وہ یتیموں کی سی صورت بنائے یا تو بے دھیانی سے بیٹھا رہتا یا کوئی نہ کوئی ایک آدھ بیو قوفانہ سی بات کر دیتا جس پر سب ہنس پڑتے۔ شیدا کوچوان اپنی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے ایک دھموکا اس کی کمر پر رسید کرتا "اوے رحیمے یار تو وی کدی مرد جوان بن۔ کوئی قصہ کوئی کہانی۔۔۔ او ہمیں بھی خوش کر نہ یار کچھ سنا کر"۔ علی بخش شرارت سے مسکراتا "نہ کر یار شیدے اینوئیں اسے تنگ نہ کر دیکھتا نئیں بے چارہ ستاں تیاں ورگا پتر ہے" اس پر زوردار قہقہہ پڑتا اور رحیما بے چارہ بھاگنے کی کوشش کرتا مگر وہ اسے بھلا کب جانے دیتے تھے کیوں کہ وہ تو محض اسے تنگ کرتے تھے ورنہ اس کی اور سرافت سے کسی کو انکار نہ تھا۔ مویا مکا بھلا مانس رحیما۔

آج وہ سر شام ہی سیدھا گھر آ گیا تھا۔ جی کچھ ماندہ تھا اور دیہاڑی بھی کم ہوئی تھی۔ سو یا بھی جلدی تھا مگر عجیب سی بے چینی تھی جو اسے بار بار جگا دیتی۔ دو چار مرتبہ اٹھ کر اس نے پانی بھی پیا۔

حلق بار بار خشک ہوتا تھا پھر وہ سو جاتا سوا سی نیم غنودگی میں، جب کسی کے کودنے اور چلنے کی آواز آئی تو وہ دوبارہ چوکنا ہو گیا۔ اسے لگا کوئی دبے پاؤں صحن میں پھر رہا ہے۔ خیال آیا کوئی چور نہ ہو۔ پھر خود ہی اپنے خیال پر مسکرا دیا بھلا اس کچے کوٹھے میں چور کیا ڈھونڈے گا اور کیا پائے گا۔۔۔ اس کا گھر بنگلوں کی جانب سے کچی آبادی کا پہلا گھر تھا۔ آخری محل نما گھر کے آگے گرین بیلٹ اور پھر نالہ تھا۔ نالے کے دوسری طرف بدبودار کالی زمین پر کچی آبادی تھی جہاں کیڑوں مکوڑوں کی سی زندگی، انسان گزار رہے تھے۔ بھلا ہو درختوں کا کہ جنھوں نے اس پوش علاقے کی بدصورتی کو اپنے پتوں سے ڈھانپ رکھا تھا اور وہ دھبے جنھیں کوئی دیکھنا نہیں چاہتا تھا دور سے دیکھنے پر کسی خوبصورت تصویر کا حصہ نظر آتا تھے۔

قدموں کی واضح چاپ سے اسے یقین ہو گیا کہ کوئی دوسرا ذی رُوح اس کی چار دیواری میں موجود ہے۔ پہلے تو اس نے سوچا اٹھ کر للکارے پھر خیال آیا "ایک جان ہی تو ہے اسے تو بچا لو۔۔۔ پھر یوں لگا جیسے کوئی دیوار پھاند کر نکل گیا ہو۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد شور سا اٹھا "چور چور پکڑو پولیس" ملی جلی آوازوں سے علاقہ گونج اٹھا۔ رحیمے کو جھٹکا سا لگا۔ اس نے لالٹین جلا کر اپنے واحد کمرے اور صحن کی تلاشی لی۔۔۔ اس کا ست ذہن یکدم بے دار ہو گیا۔ کونے میں پڑی لکڑیاں کچھ بے ترتیب سی ہو رہی تھیں۔ رحیمے نے ٹٹولا تو ایک چھوٹی سے گٹھڑی برآمد ہوئی۔ معاملہ اس کی سمجھ میں آنے لگا فوراً کمرے میں جا کر گٹھڑی کو کھولا تو نوٹوں کی جانے کتنی ہی گڈیاں اسے آنکھیں مار رہی تھیں۔ "آؤ ہمیں اپنا لو آج تک تمھارے ساتھ ہے تمھارے عمر بھر کے خوابوں کی تعبیر ہمارے بدن میں چھپی ہوئی ہے ہماری خوشبو تمھارے اداس جیون کو بہاروں سے سجا دے گی" رحیما کھو سا گیا۔

"دروازہ کھولو" کسی سپاہی کی کڑک دار آواز نے رحیمے کو اس کی جنت سے گھسیٹ کر باہر نکال پھینکا "ٹھک۔۔۔ ٹھک۔۔۔ ٹھک" دروازہ جیسے ٹوٹ جائے گا۔ رحیمے نے گٹھڑی اٹھائی اور یوں دروازہ کھول دیا جیسے وہ پولیس کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ دو تین سپاہی دندناتے ہوئے اندر گھس آئے "تلاشی لوا ؤ اوئے جلدی سے"

"تلاشی کیا لینی ہے جناب۔ یہ لیجیے کوئی آدمی ادھر پھینک گیا ہے جی" رحیمے نے ایک لمحے کی

دیر کیے بغیر گٹھڑی اس کی جانب اچھال دی سپاہی بھونچکا سا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ گٹھڑی کو کھولا اور پھر رحیمے کی جانب ایسی نظروں دیکھا جیسے کہ رہا ہو ''ارے بے وقوف تجھے بھلا اس دُنیا میں جینے کا کیا حق ہے؟'' اور پھر کڑک دار آواز میں پکارا ''گرفتار کرلو اسے'' ''مگر جناب میں تو۔۔۔'' رحیما گڑبڑا سا گیا۔ اسے واقعی کچھ سمجھ نہ آرہا تھا۔ مگر کارروائی پوری کرنے والے انسپکٹر کو پتہ تھا کہ رحیمے کا اصل قصور کیا ہے؟

آدھی رات کے غل غپاڑے میں رحیمے کی گرفتاری ایک معمہ بن گئی تھی۔ چند لوگ صورت حال جاننے کو آگے بڑھے مگر سپاہیوں نے ڈپٹ کر بھگا دیا۔ سولا وارث رحیما سرکاری مہمان بن گیا۔ اسے جاتے ہی ایک کوٹھڑی میں دھکیل کر پہلے تو کاغذی کارروائی کی گئی۔ اور باقی تفتیش صبح پر ملتوی کر دی گئی رحیمے کو اس کوٹھڑی اور اپنی کوٹھڑی میں کوئی خاص فرق محسوس نہ ہوا تھا۔ صبح ہوتے ہی ایک نئی نوعیت کے عذابوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔

''ساتھی کا نام کیا تھا۔ یا اکیلے ہی کارروائی کی ہے ساری'' تفتیشی اہل کاروں کا ایک ہی سوال تھا اور رحیمے کا ایک ہی جواب ''جناب میں کچھ نہیں جانتا چور تو میرے گھر مال پھینک کر بھاگ گیا تھا''

''اوئے تو لگتا تھا چور کا ماما۔۔۔ یا ماں کا یار جو تجھے مال بخشش میں دے گیا'' تفتیشی افسر پھنکارا۔

''سر جی کیوں بے چارے کو شرمندہ کرتے ہیں۔ اسے ایسی باتوں کا کیا پتہ یہ تو اس کی ماں سے پوچھیں نا'' جونیئر حوالدار نے بدمعاشی سے مونچھ مروڑی رحیمے کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ مگر وہ بے بس تھا۔ وہ چیخ چیخ کر اپنی بے گناہی کا رونا روتا رہا مگر ۴۸ گھنٹوں میں اس کے جسم کو اتنا کچلا گیا۔ اس کی انا کی اتنی تذلیل کی گئی کہ اسے خود سے نفرت ہونے لگی۔ اپنے وجود سے گھن آنے لگی۔ جب گدھوں نے دیکھا کہ اب تو مردار۔۔۔ مردار بھی نہیں رہا تو رحیمے کو چوسی ہوئی گنڈیری کی طرح تھانے کے باہر ڈنڈا ڈولی کر کے پھینک دیا گیا۔ کہ اصل چور کا تو پچھلی ہی رات سراغ مل گیا تھا۔

وہ اپنی لیر لیر رُوح اور داغ داغ جسم کو گھسیٹتا خاموشی سے آن کر اپنی کوٹھڑی میں پڑ گیا۔ شیدے اور علی بخش نے آ کر چھوا تو بدن بخار سے پھنک رہا۔۔۔ جانے کتنے دن رحیما بے ہوش رہا۔

اس کی مرہم پٹی دوادارو وہ دونوں باقاعدگی سے کرتے رہے۔ مولوی فضل بھی کئی مرتبہ اسے دیکھنے آئے۔ تسبیح کے دانے گراتے ہوئے انھوں نے بھلا اب ان باتوں سے کیا لینا دینا تھا۔۔۔ بظاہر وہ ٹھیک ہوگیا، کام پر بھی جانے لگا مگر اب نہ کسی سے بات چیت نہ سلام دعا، نہ صبح کی نماز، نہ مسجد میں پہلے کی طرح بیٹھنا۔ کام سے آکر سرِ شام ہی کمرے کا دروازہ بند، پہلے پہل تو سبھی نے کوشش کی اسے دوبارہ زندگی کی طرف لانے کی۔ مگر نا کام رہے آخر کب تک؟ سب نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا، اس اُمید پر کہ شاید خود ہی سنبھل جائے۔

دن، مہینے اور مہینے سالوں کے پیچھے بھاگتے رہے، رحیما نوجوانی سے سیدھا ادھیڑ عمری کی منزل تک پہنچ گیا۔ اس کی موجودگی یا عدم موجودگی اس علاقے کے لوگوں کے لیے ایک برابر تھی، اس کا قصہ اب پرانا ہو چکا تھا، جبر و تشدد کی فضا میں کوئی ایک رحیما ہوتا ہے بھلا؟ یہاں تو کتنے ہی رحیمے آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو کب تک یاد رکھا جائے۔ سو لوگ اسے بھی تقریباً بھول سے گئے وہ جو گناہ گار تھے وہ بھی! اور جو شریکِ غم تھے وہ بھی، مگر رحیما نہیں بھولا تھا۔ اپنے قصے کو۔۔۔ اسے تو ان ۴۸ گھنٹوں کا ایک ایک لمحہ اپنی تمام تر بدصورتوں اور کراہتوں سمیت یاد تھا اس کی زخمی انا سے مسلسل اکسائی رہتی تھی۔ ایک آگ تھی جو اسے سلگائے رکھتی تھی۔ وہ ایک خاص وقت کا منتظر تھا۔ ایک خاص لمحے کا۔۔۔ اسے یقین تھا کہ وہ لمحہ آئے گا اور ضرور آئے گا اس کا ایمان ایک سیکنڈ کو بھی نہیں ڈگمگایا تھا۔ آخر ایک رات وہ لمحہ اس کی زندگی میں آ ہی گیا۔ بالکل اسی طرح۔ اسی وقت جس طرح پندرہ سال پہلے آیا تھا کہ اس کا گھر کچی آبادی کا پہلا گھر تھا اور پوش گھروں سے صرف ایک گندے نالے کے فاصلے پر۔ جہاں کبھی نہ کبھی پھر کسی لمحے کسی چور نے پناہ لی تھی یا [illegible] سے جان چھڑانی تھی۔

وہی دھم کی آواز آج اس کے کانوں میں رس گھول گئی کہ اس آواز کو سننے کے لیے تو وہ پچھلی کئی سالوں سے جاگ رہا تھا۔ وہ سنتا رہا۔۔۔ قدموں کی چاپ۔۔۔ دیوار پھاندنے کی آواز اور پھر گلی میں چور چور کا شور۔۔۔

اس نے دیوار سے بھری گٹھڑی اٹھا کر ایسی جگہ چھپا دی جو پچھلے کئی سالوں سے کسی ایسی

ہی گھڑی کے لیے تڑپ رہی تھی۔ کسی بانجھ کوکھ کی طرح۔۔۔ رحیمے کو تو بس صبح کا انتظار تھا۔ اس صبح کا جو ایک نئے رحیمے کا جنم دیکھے گی، رحیمے کا جنم دیکھے گی، رحیمے نے کس سے کہاں پر۔۔۔ اور کیا حساب لینا ہے۔۔۔ یہ تو رحیما پندرہ سال پہلے ہی سوچ چکا تھا۔۔۔

☆☆☆

کیتھارسس

''یار یہ کیا پاکھنڈ بنا رکھا ہے تم نے؟

''کچھ نہیں بس بس کچھ چیزیں ڈھونڈ رہی تھی۔ جانے کیا ہو گیا ہے ذہن کو ٹھکانے پر ہی نہیں رہتا رکھی کہیں ہوں، ملتی کہیں سے ہیں اور ڈھونڈتی کہیں رہتی ہوں''

''چیزیں ایسے ڈھونڈی جاتی ہیں بھلا۔۔۔ سارا کمرہ بے ترتیب ہو رہا ہے لگتا ہے، چیزیں نہیں تم خود کہیں گم ہو گئی ہو''

''واقعی خود گم ہوئے بغیر بھلا کسی نے کچھ پایا ہے؟ خود کو پانے کے لیے سب کچھ کھو بیٹھی اور اب خود کو بھلا کر کھوئی ہوئی چیزیں ڈھونڈتی پھرتی ہوں جانے کیا ٹھیک ہے کیا غلط؟ تم میری مدد کرو نا پلیز''

''یار تم آج کل کچھ زیادہ قنوطی نہیں ہوتی جا رہیں سیدھی سی بھی بات کرو تو تم اس کے بخیے ادھیڑنے لگتی ہو چکر کیا ہے آخر فلاسفر صاحب''

''سنو تم خانہ بدوشوں کے بارے میں کچھ جانتی ہو کیا؟''

''یہ کیا تک ہوئی بھلا، سوال گندم جواب جو، یہ خانہ بدوش کہاں سے آن ٹپکے بیچ میں؟ مَیں تو صرف تمھاری خیریت نیک مطلوب چاہتی ہوں''

''تم کبھی تو سنجیدہ ہو جایا کرو نا یار، مَیں نے سنا ہے کہ خانہ بدوش کے خیموں تلے، جب گھاس اُگنے لگتے تو وہ وہاں سے کوچ کر جاتے ہیں جانتی ہو بھلا کیوں''؟

''مجھ سے مشورہ ہرگز نہیں کرتے وہ''

اس لیے شاید کہ وہ Monatony سے گھبراتے ہیں Stagnation سے اُنھیں نفرت ہے وہ ہر دم حرکت میں رہنا چاہتے ہیں کہ حرکت زندگی ہے دیکھو وہ آرام سے بھی تو زندگی گزار سکتے ہیں نا''

''جی ہاں جیسا آرام آپ فرما رہی ہیں وہ آرام اُنھیں بھلا کیوں نصیب؟''

لیکن اُنھیں تو پاؤں کے آبلوں سے پیار ہے۔ ان کے لہو میں ان کے Genes میں ایک وحشت مچلتی ہے جو ایک دعا یا بد دعا کی طرح ان کا پیچھا کرتی ہے اُنھیں قیام سے، سکون سے دوستی نہیں کرنے دیتی، مشقتوں سے مصائب سے گلے ملنے پر اکساتی رہتی ہے''

''واہ کیا فلسفہ ہے آپ تو خاصی ذہین ہوتی جا رہی ہیں، لیکن مجھے تو اس وقت چائے اور گرم گرم چپس کی طلب ہو رہی ہے۔ پلیز آپ کے ثقیل لیکچر اس وقت ہضم نہیں ہو رہے۔''

''تم تیسرے درجے کی انسان ہر وقت معدے سے مت سوچا کرو۔

یہ greymatter ہے نا یہ بھی تمھارے ہی استعمال کے لیے ہے۔ ہاں Grey سے یاد آیا۔ کیا تم گرے چیزوں پر یقین رکھتی ہو؟

''گرے چیزیں؟ یار یہ کون سی نئی ٹرمینالوجی ایجاد کی ہے آپ نے؟''

''منافقت میری جان منافقت۔۔۔ دیکھو دنیا میں بس دو ہی تو تیں ہیں۔ خیر یا شر سفید یا سیاہ! یہ جو درمیانی راہیں ہیں نا مصلحتیں سمجھوتے Diplomacies یہ سب Grey ہیں جو انسان نے اپنے اندر کی سیاہی کو چھپانے کے لیے ایجاد کیے ہیں۔ سفید اور سیاہ مل کر Grey کو جنم دیتے ہیں یوں سفید اور سیاہ دونوں کی شناخت ختم ہونے لگتی ہے اور جانتی ہو پھر کیا ہوتا ہے؟''

''جانتی ہوں فلاسفر صاحبہ ایک دھماکہ ہوتا ہے اور ہم سب Finshed''

''نہیں میری جان نہیں! انسان کے اندر سیاہی Adopt کرنے کی صلاحیت بڑھنے لگتی ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ تم اب اس کمرے کی بغل سے نکلو غضب خدا کا تم تو بالکل مجذوب ہو گئی ہو سمیع سے منگنی کیا ٹوٹی تمھارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ہر وقت یہاں گھسی نہ جانے کیا کیا سوچتی رہتی ہو "I am realy worried"

''تم سمجھتی کیوں نہیں۔۔۔۔۔ سمیع سے منگنی ٹوٹنا کسی دکھ کی علامت نہیں ہے۔ اس تجربے نے تو مجھے وہ خود شناسی اور آگہی بخشی ہے کہ میں اس حادثے کی شکر گزار ہوں۔ مجھے ادراک ہوا ہے کہ میں اتنی بھی کمزور نہیں جتنی کہ میں خود کو سمجھتی تھی۔ اپنی ذات کے کئی بھید مجھ پر ان چند ماہ کے دوران کھلے ہیں۔ اس کائنات کے کئی راز فاش ہوئے ہیں۔ مَیں بھی تو اسی کائنات کا حصہ ہوں نا اور تمھیں پتہ ہے اب مَیں نے چیزوں کو نئے زاویوں سے دوسروں کے حوالوں سے دیکھنا شروع کر دیا ہے۔''

''مثلاً'' یہ کہ دُنیا اور اس کے دھندے اتنے اہم نہیں جتنے کہ ہم سب نے سمجھ رکھے ہیں۔ پرسوں مَیں اپنے کمرے کا نیا ہیٹر خریدنے گئی۔ وہیں ایک خاتون ایک ایسے ہیٹر کی تلاش میں تھیں جس کی دس سالہ گارنٹی ہو۔ بڑی تلاش کے بعد اُنھیں ایک ہیٹر پسند آیا۔ کافی قیمتی اور خوبصورت تھا۔ وہ خوش خوش اسے پیک کروا کر اپنی کار کی جانب لوٹ رہی تھیں کہ۔۔۔''

''کہ کیا ہوا۔۔۔؟

میری آنکھوں کے سامنے ایک تیز رفتار کار نے اُنھیں کچل دیا۔''

She died at the spot

''اوہ تم نے آنکھوں سے دیکھا "My goodness"

تو اور کیا۔۔۔ اصل میں یہ ساری پکڑ دھکڑ۔۔۔ یہ سب ساز و سامان۔۔۔ یہ سب گارنٹیز۔۔۔ یہ سب Securities اس لیے کی جاتی ہیں کہ اندر کہیں دور یہ خوف پھن پھیلائے کھڑا رہتا ہے کہ یہ سب کچھ چھن جائے گا۔ کسی لمحے کسی بھی صورت''

''مگر کچھ لوگ زندگی کے بارے میں لاپرواہ رویے بھی تو رکھتے ہیں اُنھیں کسی قسم کی گارنٹی کا یا چیزیں جمع کرنے کا کوئی شوق نہیں ہوتا۔''

''ایسے لوگ اسی خوف سے آزاد ہوتے ہیں۔

They believe in unbelieveables.They are sure about the uncertainities

مَیں جانتی تھی کہ میں اور سمیع زیادہ دور تک نہیں چل سکیں گے۔ ایک دوسرے کے لیے نازک جذبات رکھنے کے باوجود کہیں ایک تشنگی۔۔۔ ایک خلا سا محسوس ہوتا تھا۔ اس Relationship میں۔۔۔ کہیں کوئی کچھ تھا جو پوری خوشی نہیں دیتا تھا۔ سمیع کے ساتھ سارا سارا دن گزار کر بھی رُوح میں ایک سناٹا سا طاری رہتا تھا۔ وہ ہینڈسم تھا Caring تھا پیسے والا تھا مگر ہماری Frequencies شاید مختلف تھیں۔

''بڑے بڑے انکشافات ہو رہے ہیں آج۔ مَیں تو سمجھتی تھی کہ تم اس کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتیں''

''مجھے بھی یہی شک تھا اصل میں وہ محض ایک خوبصورت دیوتا تھا۔ پوجا کے قابل اور بس۔۔۔ ایسا بت جو پتھر کا ہوتا ہے اور داسی کی ذات محض آرتی اتارنے کے لیے ہوتی ہے۔ داسی خود اپنی ذات میں کتنی اہم ہے۔ یہ دیوتا نہیں سوچا کرتے یہ تو عام آدمی کا کام ہے۔۔۔ مجھے ایک عام آدمی چاہیے تھا، جس کے ساتھ میں لڑ سکوں جھگڑ سکوں۔ شدت سے کا پیار کر سکوں۔۔۔ جذبات میں ناپ تول تو گھٹن پیدا کرنے لگتا ہے۔ مَیں Grey رنگ دیکھ دیکھ کر Colorblind ہونے لگی تھی۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم نے خود۔۔۔''

ہاں یہ فیصلہ میرا اپنا تھا۔۔۔''

''اس نے Resist نہیں کیا۔۔۔''

''سمجھایا مگر بالکل ویسے ہی جیسے دیوتا Cermon دے رہا ہو۔۔۔''

''What''؟

''اور اس Pope والے انداز نے مجھے مزید طمانیت دی کہ میرا فیصلہ صحیح تھا۔''

''تم چاہتی تھیں کہ وہ تم سے لڑتا جھگڑتا اور تمھیں فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیتا۔''

''کاش وہ ایسا کر سکتا۔''

''ویسے By the way وہ آج کل ہے کہاں۔۔۔ کوئی Contact کیا اس نے دوبارہ؟

''ہاں شروع میں کچھ کوشش کی اس نے۔۔۔ پھر سنا تھا کہ امریکہ چلا گیا تھا، کسی Official course کے لیے تب سے خاموشی ہے باہر کی دُنیا میں''

''اور اندر؟

''اندر ایک آگہی کا طوفان ہے جس پر بند باندھتے باندھتے میرے اعصاب شل ہونے لگے ہیں۔ صحیح کہتے ہیں کہ ڈیم کے کسی بھی کونے پر لگا ننھا سا شگاف بھی بڑے بڑے طوفان کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ مگر mind it کہ اس سیلاب نے میری ذات کو زرخیز کر دیا ہے۔ تباہ نہیں کیا۔۔۔ ایسے ایسے جھماکے ہیں اندر کہ من کی دُنیا خیرہ و روشن ہو گئی ہے، مگر Boy تم یہ سب کچھ نہیں سمجھو گی''

''I am impressed یار تم تو واقعی بدھا کی مریدنی لگ رہی ہو ایسی باتیں کرتی ہوئی''

''پتہ نہیں کیا سمجھ رہی ہو تم مگر شہرت دولت نام سب کچھ واجبی سا لگتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے پلاسٹک کے کھلونے! میرے اندر کی ترتیب بدل گئی ہے۔ Priorites بدل گئی ہیں۔ شاید Eternal truth پر یقین آ گیا ہے یا کچھ اور''

''خلل تو دماغ کا پرانا تھا مگر اب تو بالکل خدا ہی حافظ ہے تمھارا۔۔۔ کس دُنیا کی باتیں کر رہی ہو تم۔۔۔ مجھے تو لگتا ہے جا کر اسپرو کھانی پڑے گی یا جھیل کے کنارے چہل قدمی کرنی پڑے گی تا کہ آپ کی باتوں کی کثافت دور کر سکوں''

''اس دُنیا کی بات کرتی ہوں۔۔۔ شاید آنکھیں کھل گئیں من کی۔۔۔ تم نہ سمجھ پاؤ تو اور بات ہے۔

Its a blessing as well curse!

لگتا ہے فون کی بیل بج رہی ہے‘‘

’’میں دیکھتی ہوں

’’کون تھا کیا ہوا؟ اتنی ڈسٹرب کیوں ہو خیریت تو ہے نا؟

’’بت دیوتا! بت ٹوٹ گیا ہر بت کو ایک دن ٹوٹ ہی جانا ہوتا ہے۔ دیوتا نے جون بدل لی ہے مگر بہت دیر ہو چکی ہے۔ آرتی کے پھول مرجھا گئے ہیں داسی کا شعور جاگ گیا ہے اب وہ نرتکی نہیں بن پائے گی۔

اس نے صوفے سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں اور آنسو دھیرے دھیرے اس کا مطمئن سا چہرہ بھگونے لگے۔

☆☆☆

آدھا سچ

وہ فون رکھ کر سوچ میں پڑ گئی ناقدانہ نظروں سے اپنا جائزہ لیا۔۔۔ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑی ہو کر خود کو گھوم گھوم کر ٹھیک تو لگ رہی ہوں۔ بالوں کو جھٹکے سے دے کر کبھی آگے بکھیرا کبھی پیچھے کر لیا۔۔۔خوبصورت گردن پر ہولے ہولے ہاتھ پھیرا۔ ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ وہ جانتی تھی کہ جو اسے بلا رہا ہے وہ اس کی طلب میں مرا جا رہا ہے۔۔۔اپنی اہمیت کے احساس نے اس کی چال میں تمکنت سی پیدا کر دی۔ اپنے بھرپور جسم اور پرکشش چہرے سمیت اس نے کمرے کے بند دروازے کے پاس لگی قدیم نرتکیوں کی رقص کے انداز میں Abstract پینٹنگز کو دیکھا۔ پائیدان پر پڑے جوتوں سے اندر موجود لوگوں کی تعداد کا اندازہ لگایا اور ہولے سے دروازے پر دستک دی۔ ’’Yes‘‘ اندر موجود ان چاروں میں سے ایک نے باآواز بلند پکارا عورت نے ہینڈل بڑے دھیمے سٹائل سے گھمایا اور ’’ہیلو‘‘ کہتے ہی جیسے اندر کے خلا میں تیرنے لگی۔ سحر انگیز نیم تاریکی تھپک۔۔۔تھپک کر سلا دینے والی کیفیت جو بیک وقت احساس کو جھنجوڑ کر جگا دے۔۔۔AC کی خنکی سگرٹوں اور شراب کی باس کا ملا جلا عجیب سا تاثر جیسے ساون کے موسم میں گندے نالے کی بو۔۔۔کنارے کنارے اگے ننھے منے معصوم سے پھولوں کی خوشبو سے گڈ مڈ سی ہو جائے۔۔۔TV کی سکرین پر رنگوں کے بنتے مٹتے دائرے مختلف شکلیں اختیار کرتے اور

پھر بگڑ جاتے۔ کئی لمحے وہ چندھیائی نظروں سے کمرے کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ جو دو بڑے تھے ایک جہازی سائز بیڈ پر نیم دراز تھے ایک نے کرتا شلوار اور دوسرے نے ٹی شرٹ اور برمواد پہن رکھا تھا۔۔۔ اور وہ دو جو نسبتاً کم عمر تھے، نیچے قالین پر بیٹھے تھے میز پر وسکی کی بوتلیں گلاس اور بلوریں پیالے میں برف دھری تھی۔۔۔ دیواروں پر جابجا عریاں تصویریں، اس نے بیک وقت خوف اور تجسس کے مارے جھرجھری سی لی پہلے تو جی چاہا کہ بھاگ کر واپس چلی جائے مگر اندر سے سرگوشی ''ابھی دیکھو تو سہی سنو تو سہی ضروری تو نہیں جو نظر آرہا ہے وہ واقعی ویسا ہو''

وہ جو حلیے سے فرنچ سکالر تھا، وسکی کا گھونٹ لے کر اپنی بھوری بھوری مونچھیں صاف کرتے ہوئے ایک مکار بلے کی طرح مسکرایا، اس کی نیلی کانچ سی آنکھیں T.V سے منعکس ہوتی ہوئی رنگین روشنیوں میں ایک پراسرار مگر خوبصورت پرزم کی طرح چمک رہی تھیں، سفاک بے جذبہ نگاہیں! "Hello bab How are you" اس نے اپنے مخصوص بھاری لہجے میں کہا اور ساتھ ہی ایک آنکھ دبا دی لہجہ مستی سے چور تھا وہ دھک سے رہ گئی ''یار مائنڈ نہ کرنا انھوں نے ابھی Anesthesia لیا ہے'' بیڈ پر پڑا اس کا ساتھ مزید بدمعاشی سے آنکھ میچ کر بولا اور ساتھ ہی قہقہہ مار کر ہنس دیا وہ بھی شاید ٹن تھا۔ ''اسے ایسا قہقہہ ہی جچتا ہے'' وہ گھبراہٹ میں بھی سوچے بغیر نہ رہ سکی۔

اپنے چہرے کی ساخت اور فطرت کے حساب سے وہ ایک کاؤبوائے جیسا تھا۔ آزاد منش، مدر پدر آزاد، مضبوط جبڑے، آنکھوں میں بغاوت اور باریک مونٹ اس کی خود غرض اور من موجی طبیعت کے آئینہ دار تھے، دبلا پتلا سا۔۔۔ ''کتنا تضاد ہے اس کی ہیئت میں اس کی باتوں کی طرح'' عورت نے سوچا ''مگر نہیں شاید'' ۔۔۔ اس کی سوچ نے اس کی تردید کردی ''یہ تو ویسا ہی ہے جیسا دکھتا ہے، اپنے جذبوں کو اپنی نیت کو اپنی خواہش کو چاندی کے قوام میں؛ لپیٹ کر خوشبو لگا کر کسی سنہری طشتری میں کیموفلاج کر کے پیش کرنے کی بجائے یہ تو سینے سے بھینچ کر بوسہ دینے والا یا گولی بھیجے سے پار کردینے والا ہے'' ۔۔۔ اس نے فرش پر بیٹھتے بیٹھتے یہ سب کچھ سوچ ڈالا ''ارے آؤ نہ ادھر اوپر بیٹھ جاؤ'' کاؤبوائے نے آفر دی عورت نے بیڈ کی شکنوں پر نظر ڈالی اس میں دھنس جانے

کے امکان پر غور کیا اور اپنے بدن کو سمیٹتے ہوئے قالین پر بیٹھ گئی۔

وہ جانتی تھی کہ سب کی نظروں کی زد میں ہے لمبے بال رنگین روشنی میں قوس قزح کی طرح پھیل رہے تھے میوزک پر تھاپ دیتے گدرائے ہوئے پاؤں سفید کبوتروں کا جوڑا دکھائی دے رہے تھے، جو اڑاری کے لیے پھڑپھڑا رہا ہو۔ قالین پر بیٹھا کم عمر بھولے بھالے چہرے والا لڑکا اس کی قربت کی آنچ سے پگھلنے لگا۔۔۔ اپنی دبلی پتلی ٹانگوں کو سمیٹتے ہوئے اس نے جلدی جلدی یخ بستہ وسکی کے چند گھونٹ حلق میں انڈیلے اور تھوڑا سا سکڑ گیا۔۔۔ شاید اپنی خواہش کے برعکس۔۔۔ عورت لاپرواہ سی بنی اس کے قریب چوکڑی مارے بیٹھی رہی۔۔۔ اوپر لیٹے دونوں ایسے گھاگ شکاریوں کی طرح مسکرائے، جو جال میں آتی چڑیا کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں ''یار ہم Portest کرتے ہیں Back to Comera پالیسی نامنظور'' بلے کی شکل والا شرارتاً چلایا ''آہستہ بولو بے وقوف'' کاؤبوائے نے ڈپٹا ''خواہ مخواہ ہی تم تو Jealous ہو رہے ہو، بیٹھنے دو جہاں بیٹھتی ہے۔ ہے تو آخر ہمارے درمیان ہی نا''

وہ پھر آنکھ میچ کر مسکرایا کہ اس لمحے اس کی تمام تر ہمدردیاں کم عمر آرٹسٹ کے لیے تھیں ''اور ہاں آپ ذرا اپنی خوبصورت ٹانگیں طشتری سے اب نکال لیں'' کاؤبوائے نے بلے کو دیکھ کر طنزاً ہانک لگائی ''تم جانتے تھے کہ لیلیٰ آرہی ہے جبھی تو نکر پہن کر اپنی ٹانگیں Tray میں سجادی ہیں'' اس نے اس کے برمواد پر چوٹ کی وہ بدستور اس کا خاکہ اڑا رہا ہے شاید اس لیے بھی کہ کاؤبوائے کی اپنی ٹانگیں مور جیسی تھیں۔ لیلیٰ نے مڑ کر دیکھا اور بھرپور طریقے سے ہنس پڑی۔

وہ سب سمجھ رہی تھی۔ ان چاروں کے مخفی جذبے آنچ دینے لگے تھے وہ ان کے جذبوں سے کھیلنے میں اب Enjoy کر رہی تھی کبھی ہوا دے دیتی، کبھی ہولے ہولے چھینٹے ڈال دیتی۔ ایک ان دیکھا سا دھواں ''ٹھس ٹھس'' کی آواز کے ساتھ ان کے اعصاب کو ایک بے نام سی لذت سے آشنا کر رہا تھا۔ ٹوٹتے کھنچتے اعصاب ایک Thrill پیدا کر رہے تھے۔ اسے اپنے ہونے کا بھرپور احساس دلا رہے تھے وہ جانتی تھی کہ یہ سب کچھ لمحاتی ہے مگر یہ سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔۔۔ وہ تو کھوج رہی تھی سچ کو جھوٹ کو۔۔۔ سچ کو منافقت کو۔۔۔ یا شاید خود کو۔۔۔ کاؤبوائے کہتا ہے ''خود

کو ہار دیے بغیر جسم کی آلائشوں سے نکلے بغیر جسم کو بے کار جانے بغیر اصلیت کھوجنا بہت مشکل ہے۔ پہلے جسم کو Surrender کرو خود کو مارو پھر رُوح تک رسائی ہوگی'' ۔۔۔وہ کہتی ہے ''جسم کو درمیان میں نہ لاؤ تم تو جسم کی نفی کرتے کرتے جسم کو مزید اہم بنا رہے ہو، بھول جاؤ جسم کو اصل چیز رُوح ہے سوچ ہے'' دونوں کی بحث طول پکڑ جاتی ہے کاؤبوائے بولے جاتا ہے۔

وسکی اپنا رنگ جما رہی ہے گالیاں فلسفہ مذہب آرٹ سب کچھ گڈمڈ سا ہو جاتا ہے۔ ناچتے رنگ، بنتے بگڑتے نقوش، نیم برہنہ جسم، سب کچھ سکرین پر تیزی سے چلنا شروع ہو جاتا ہے۔۔۔ ایک نیا کیتھارسس جنم لیتا ہے وہ چاروں موسیقی کی لے پر سر دھننے لگتے ہیں، مشرق مغرب گلے ملنے لگتے ہیں۔۔۔ سب رنگ ایک دائرے میں گھوم رہے ہیں۔ موسیقی کا شور دھیما اونچا بے ہنگم۔۔۔ اور پھر بے ہنگم تر ہو جاتا ہے، سماعت اندھی ہونے لگتی ہے۔۔۔ اور وہ جو ہڈیوں کے پنجر جیسا طوطا ناک پر عینک جمائے بیٹھا تھا اپنی آبنوسی چندیا پر ہاتھ مارتا ہے۔۔۔ بوڑھے حلیے کا وہ نام نہاد جوان کبھی جھومتا کبھی ہنستا۔ اپنی سوکھی لکڑی جیسی ٹانگوں میں انگلیوں کو چھبوتے چھبوتے جانے کون سے فلسفے کی رو سے آٹھ کا ہندسہ بن کر بیٹھ جاتا ہے سکرین پر خاص Points بار بار فوکس کیے جاتے ہیں چاروں جیسے وجد کے عالم میں جھومنے لگتے ہیں۔

''واہ کیا بات ہے''۔

''یار ذرا پھر Revind کرنا''۔

وہ چاروں پوری طرح مست ہو چکے ہیں عورت کی موجودگی سے شاید بے خبر ہو چکے ہیں، یا شاید نہیں۔۔۔ بھی۔۔۔ عورت ایک خاص مقام سے اُنھیں دیکھتی ہے وہ خود فوکس میں ہوتے ہوئے بھی اس لمحے Out of Focus ہے یا کیمرہ کے پیچھے ہے یہی تو اس کا کمال ہے اور یہی اس کا طلسم۔۔۔ وہ منظر کا حصہ ہوتے ہوئے بھی منظر سے اوجھل رہتی ہے۔ ناگواری کا جو احساس اسے اندر آتے وقت تھا وہ اب زائل ہو چکا ہے۔ وہ محسوس کرتی ہے کہ وہ چاروں تو بے حد بے ضرر سے بگڑے ہوئے بچے ہیں، ضدی۔۔۔ اپنی منوانے والے اور جلد ہی مان جانے والے over reactionary مگر بے ریا۔۔۔ ان چاروں کے چہروں پر اس وقت طمع نہیں کوئی جھوٹ

نہیں۔ اپنے اصل میں آ کر دھمال ڈال رہے ہیں، ایسی دھمال جو اُنھیں خود کو Fale کرنے، خود سے نظریں ملانے کا حوصلہ بخش رہی ہے یہ دھمال تو خود سے ملاقات ہے خود آگہی ہے ''ہاں'' وہ چونک جاتی ہے۔

کاؤبوائے نعرہ لگاتا ہے '' کچھ بھی سچ نہیں سب جھوٹ ہے جسم کے سوا زندگی کا ہر راستہ رُوح کا ہر فلسفہ جسم کی چھلنی سے گزرے بغیر ادھورا ہے باقی سب بکواس ہے اس کے منہ سے فحش گالیوں کے ساتھ ساتھ سچ کے چھینٹے اُڑ رہے ہیں۔

ان کے تمام رنگ جھڑ رہے ہیں وہ ہلکے پھلکے رنگ جو وہ دن بھر مجبوراً اوڑھے رکھتے ہیں وہ Bleach ہو رہے ہیں۔ اپنے اصلی اور فطری رنگ کے ساتھ نکھر رہے ہیں۔ کم عمر آرٹسٹ دھیمے نرم لہجے میں بات کرنے والا سہما سا بکری جیسا ممناتا ہے ''بہت خوبصورت کوشش ہے مگر انجام کچھ واضح نہیں'' اس کا اشارہ شاید اس Art Movie کی طرف ہے جو وہ دیکھ رہے تھے ''انجام ہاں انجام'' کاؤبوائے جھومتا ہے ''انجام تو کسی کو بھی پتہ نہیں جسے End کی خبر ہو جائے، وہ خدا بن جائے یا سوامی۔''

''اور تم خود کو شاید سوامی سمجھتے ہو تبھی تو سب کو کم تر سمجھتے ہو، سب کو رد کرتے ہو مگر پورا سچ تو تم بھی نہیں جان پائے تم تو صرف آدھے سچ کے گواہ ہوا'' وہ بے خوفی کے ساتھ کہتی ہے۔

''ہاں مَیں سوامی ہوں مَیں سچ سے واقف ہوں'' سوامی بستر پر سر پٹختا ہے'' مجھے اس جسم کی سوغات دے دو، کیسی ہو تم مَیں جاننا چاہتا ہوں، تمھیں کھوجنا چاہتا ہوں سینہ سق کر کے دیکھو دان ارے دو سوامی کو داسیاں تو دان دیتی ہیں مگر تم۔۔۔ تو اپنی عصمت وغیرہ کو کسی شاپر میں لپیٹ کر الماری کے خفیہ خانے میں رکھنے کی قائل ہو'' وہ زہر اگلنے لگتا ہے لیلیٰ اطمینان سے مسکراتی ہے'' یہ حق کو "Personal freadom" کے تو تم قائل ہونا۔ مذہب سے قطع نظر مَیں تو اپنے Right کی بات کرتی ہوں میرے جسم پر صرف میرا اپنا اختیار ہونا چاہیے اور بس۔۔۔''

عورت کا لہجہ بے خوف اور قطعی تھا۔

''تو پھر جاؤ چلی جاؤ کیوں میرے راستے میں آتی ہو بار بار'' نشہ طلب بن کر اب کاؤبوائے

کی رگوں میں ناچ رہا تھا، مگر کیسی عجیب بات تھی کہ وہ ان چاروں کے درمیان خود کو محفوظ محسوس کرتی ہے۔ بند کمرے میں نشے میں مدہوش طلب کے ہاتھوں چور۔۔۔ہاتھ بڑھائیں تو شانتی ان کے ہاتھ آجائے مگر انسانی رائے کا احترام ان کا نعرہ ہے جس پر وہ قائم ہیں۔

لیلیٰ سوچ میں پڑ جاتی ہے ان کے چہروں پر کوئی ایسا لیبل نہیں جسے اُنھیں کمرے کے باہر چھوڑ کر آنا پڑے اور جاتے ہوئے پھر سجانا پڑے۔ ان کے چہرے تو ہیں ہی ننگے۔۔۔تھوڑی دیر تک وہ سب یکسر بے گانہ ہو جاتے ہیں۔ بکتے جھکتے اصلی چہروں سمیت ایک دوسرے کے قریب لڑھک جاتے ہیں، عورت چند ثانیے کھڑی اُنھیں دیکھتی رہتی ہے ان بگڑے ہوئے بچوں کو۔۔۔ جو کم از کم آدمیت کے اصولوں سے منحرف نہیں، اس کی مامتا تڑپنے لگتی ہے۔ سینے میں ٹیسیں اٹھنے لگتی ہے۔ وہ بڑے بڑے پیار سے ان سب کو سیدھا کرتی ہے۔ دھیرے دھیرے ان کے لباس درست کرتی ہے۔ بکھرے بالوں کو اپنی مخروطی انگلیوں سے سنوارتی ہے گلاس ترتیب سے رکھتی ہے۔ ان کے سروں کے نیچے کش رکھتے ہوئے چہروں پر آئے پسینے کو ڈوپٹے کے کونے سے پونچھتی، پیشانیوں پر ایک ایک بوسہ ثبت کرتی اس حجرے سے نکل آتی ہے، جہاں زندگی اپنے آدھے سچ کے ساتھ زندہ ہے۔۔۔بے ریا اور بے وفا!

☆☆☆

شاباش

وہ سردیوں کی ایک چمکیلی صبح تھی۔ گملوں میں لگے پودوں پر کچھ زرد پتے دھوپ کی سنہری کرنوں سے اور بھی نمایاں ہو رہے تھے۔ مَیں نے سوچا چلو ان کی چھانٹی بھی کر ڈالوں اور گملے بھی سیٹ کرلوں۔ سرسبز سدا بہار پودوں کے ساتھ سرخ سرخ گملے ہمیشہ ہی سے میری کمزوری بنے رہے ہیں۔ بھرپور زندگی کا تاثر دیتا ہوا یہ Combination میرے لبوں پر خواہ مخواہ ہی گنگناہٹ بکھیر دیتا ہے۔

بچوں نے ناشتہ کرلیا تھا اور آج چھٹی کو پوری طرح Enjoy کرنے کے موڈ میں تھے اپنے کمرے میں نہ جانے کیا الابلا چھان پھٹک رہے تھے۔ ان کی اپنی ہی معصوم سی مصروفیات تھیں۔ لہٰذا ان دونوں کے کمرے کی صفائی اور ترتیب وغیرہ آج میں نے فی الحال ملتوی کر دی تھی۔ بے ترتیبی کبھی کبھی چھٹی اور Relacation کے احساس کو جلا بخشتی ہے۔ بچوں کو ان کا یہ پیدائشی حق کبھی کبھار دے دینے میں کوئی حرج نہیں۔

اظہر بھی Walk سے آنے کے بعد ابھی تک اپنے ٹریک سوٹ میں ادھر اُدھر ڈولتے پھر رہے تھے۔ ماحول بے حد Relaxed تھا۔ یوں جیسے سکون کی ایک ڈھیلی سی ململ کی چادر سارے گھر نے اوڑھے رکھی ہو۔

اتنا غیر معمولی ٹھہراؤ عموماً چھٹی والے دن بھی نہیں محسوس ہوتا۔ عام دنوں میں تو ویسے ہی صبح ناشتے کی جلدی، آفس اور بچوں کے سکول کی تیاری دن بھر کے کام نپٹانے کی جلدی اور پھر سونے کی جلدی تاکہ اگلی صبح جلد اٹھ سکیں۔

لیکن آج تو ماحول اتنا گلابی اور سنہری سا ہو رہا تھا کہ نرم نرم بادلوں پر پاؤں رکھنے کا سا احساس مجھے اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھا۔ نرم نرم دھوپ اپنی پوروں سے جسم کو تھپک رہی تھی۔ مَیں نے اس ساری تازگی کو ایک لمبے سانس کے ذریعے اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی اور سٹور سے پینٹ کا سامان اور قینچی لینے چل دی۔ آتے ہی میں پودوں کی چھانٹی کرنے لگی۔ چند لمحے ہی گزرے تھے کہ ایک زوردار سی ''السلام وعلیکم'' نے مجھے چونکا دیا۔

''ارے یعقوب تم''مَیں نے حیرت زدہ رہ گئی''کہاں سے آن ٹپکے ہو۔'' جواباً اس نے عادت دانت نکوسے

''مَیں تو سمجھی تھی کہ شاید کہیں مر کھپ گئے ہو، گھر کا راستہ کیسے یاد آیا''مَیں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''ہم۔ ہم گاؤں گیا تھا وہ حسب عادت ہم۔ ہم کی گردان کے ساتھ بولا۔۔۔

کہاں ہوتے ہو آج کل''؟ مَیں اپنے کام میں مشغول رہی۔ وہ بھی قریب ہی گھاس پر پاؤں پسار کر بیٹھ گیا۔ سدا کی طرح میلا کچیلا۔۔۔ ٹوٹے ہوئے چپل اور چہرے کی درشتگی میں اضافے کے ساتھ۔

''بیگم صاحب۔۔۔ ہم۔۔۔ ہم آپ کے پاس آجائے''؟ اس نے فوراً ہی سوال داغ دیا۔

''مجھے ویسے تو کوئی اعتراض نہیں لیکن یہ تمھاری اچانک غائب ہو جانے والی عادت مجھے سخت بری لگتی ہے۔''مَیں نے صاف بات کی تو وہ کھسیانا ہو کر گھاس کے تنکے توڑنے لگا۔

ظفر بھی ٹہلتے ٹہلتے پہنچ گئے''اخاہ تو یعقو صاحب آئے ہیں'' وہ مزاقاً ہمیشہ اسے یعقوب صاحب کہہ کر بلاتے تھے۔

''سلام صاحب''یعقوب سرخ چہرے کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔

اب کتنے دنوں، مہینوں یا گھنٹوں کا ساتھ دینے آئے ہو''؟ ظفر نے پھر اسے چھیڑا۔۔۔

''قسم سے صاحب۔۔۔ ہم۔۔۔ ہم اب ہمیشہ یہیں رہے گا''۔

''ہمارے بڑھاپے تک'' ظفر نے کہا۔

''چلو ٹھیک ہے''اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا تو ہم دونوں ہنس پڑے۔

بس اشارے کی دیر تھی۔ یعقوب آدھ گھنٹے کے اندر اندر اپنے اٹیچی سمیت پرانے کمرے میں موجود تھا۔

یعقوب کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ اس کا ماضی کیا تھا؟ کوئی نہیں جانتا تھا۔۔۔ لیکن اتنا سب جانتے تھے کہ وہ بلا کا محنتی اور ایماندار تھا۔ بس تھوڑا سا غائب دماغ معلوم ہوتا تھا۔ مزے کی بات یہ کہ اس کی گارنٹی دینے والا بھی کوئی نہ تھا اور اس کے بے ضرر ہونے میں بھی کسی کو ذرہ برابر شک نہ تھا۔ خوانخواہ ہر کسی کو آج کل گھروں میں رہنے کون دیتا ہے؟ مگر یعقوب جب چاہتا اس علاقے میں جس کے گھر چاہتا ڈیرہ ڈال لیتا۔ کچھ مہینے کام کرتا۔ ذرا کوئی اونچ نیچ ہوتی تو بوریا بستر اٹھاتا اور غائب ہو جاتا۔ سال ڈیڑھ کے بعد پھر آن ٹپکتا۔

ظفر کہتے''اس کی ہم۔۔۔ ہم کی گردان اس کی شاید انا پرستی کا لاشعوری اظہار ہے۔ شاید کوئی نواب زادہ ہوگا۔ تبھی تو الٹی سیدھی بات یا ڈانٹ ڈپٹ برداشت نہیں کرتا۔''

وہ جو کوئی بھی تھا۔ بہر حال اس کے آجانے سے مجھے خاصی سہولت ہو گئی تھی۔ اوپر کے سارے کام اس نے سنبھال لیے تھے۔ تھوڑا سست ضرور تھا، لیکن جو بھی کام کرتا۔ اپنے حلیے کے برعکس انتہائی صاف اور مکمل!

بار بار کے سمجھانے پر وہ چند دن کے لیے اپنا حلیہ درست بھی کر لیتا، لیکن پھر وہی مرغ کی ایک ٹانگ، لیکن اس کی ذات میں خوبیاں اتنی تھیں کہ پلڑا بھاری ہی رہتا اور خامیاں ہوا میں معلق ہو جاتیں۔

یعقوب ہمارے ایک فرینڈز کے ہاں ملازم تھا ایک دن پتہ چلا کہ وہ ان کے بڑے بیٹے کے ساتھ لڑائی جھگڑے کے بعد وہاں سے جا چکا ہے۔ غالباً اس نے کسی بات پر یعقوب کو تھپڑ مار

دیا۔ جواباً یعقوب نے بھی گریبان پکڑ کر ایک تھپڑ مارا اور وہاں سے بھاگ گیا۔

اس واقعے کے کافی عرصہ بعد وہ اچانک ایک دن میرے ہاں آیا اسے یقین تھا کہ میں اسے رکھ لوں گی پہلے تو میں ہچکچائی، لیکن اس کی حالت زار اور میری مجبوری دونوں نے مجھے اس کے حق میں فیصلہ دینے پر مجبور کر دیا۔ اس دوران وہ دو مرتبہ مجھ سے ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہو کر چلا گیا اور پھر آ گیا۔

آج سال بھر کے بعد وہ پھر میرے پاس موجود تھا۔ بات چیت سے وہ پرہیز ہی کرتا فارغ اوقات میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا پلکیں جھپکتا رہتا۔ اس کی واحد دلچسپی T.V تھا۔ T.V پروگرامز بڑے شوق سے دیکھتا۔ کوئی ڈرامہ وہ نہیں چھوڑتا تھا۔

عین ڈرامے کے ٹائم سے پہلے وہ کام کاج سے فارغ ہو کر آن بیٹھتا۔ مزے کی بات یہ کہ اچانک ہی بلند آواز میں کسی ڈرامے یا خبروں پر تبصرہ شروع کر دیتا۔ اکثر یہ تبصرے بے وقوفانہ اور مہمل سے ہوتے، لیکن کبھی کبھار اتنے پتے کی فلسفیانہ بات کر دیتا کہ میں سوچنے پر مجبور ہو جاتی کہ کہیں اس نے کوئی سوانگ نہ رچا رکھا ہو۔۔۔ شاید یہ اتنا بھلا نہ ہو جتنا کہ اس نے خود کو ظاہر کر رکھا ہے۔۔۔ ظفر میرے ان وسوسوں کو وہم کہہ کر ٹال دیتے خود یعقوب کی حرکات و سکنات مجھے اپنی سوچ پر نادم کر دیتیں۔ غصے میں جذبات کی شدت میں اس کا چہرہ لال ہو جاتا اور زبان کی لکنت میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

ایک دن بڑے موڈ میں تھا۔ مَیں نے موقع پا کر اس کا ماضی جاننا چاہا۔ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے کئی بار اس کی ذات کو ٹٹولنے کی کوشش کی، مگر وہ ٹھس سا آدمی ٹس سے مس نہ ہوتا تھا۔ بس جواباً مسکرا دیتا تھا اور آنکھیں بولتی تھیں۔ ''ابھی نہ پوچھو کبھی نہ پوچھو''

اس دن وہ کہنے کے موڈ میں تھا۔ مَیں نے ایک تار کو چھیڑا اور پھر سر خود بخود غم کے نغموں میں ڈھلتے چلتے گئے۔

دور افتادہ پہاڑی گاؤں کے رہنے والا یعقوب سوتیلی ماں اور باپ کی زیادتیوں کا شکار رہا جنھوں نے اسے سکول سے اٹھا کر بھینس کو گوبر اٹھانے لکڑیاں لانے اور دوسرے مشقت والے

کاموں پر لگا دیا۔ بات بات پر مارنے لگے۔ یہاں تک کہ وہ ہکلانے لگا۔ ساتھی سنگی سب چھوٹ گئے۔ بس کام تھا، اور ماں باپ کی بدسلوکی۔ ''پھر ہم۔۔۔ ہم نے کئی دن بولنا چھوڑ دیا''۔ اس کی آواز اور آنکھوں میں کسی کربناک منظر کا عکس جھلک رہا تھا۔

''پھر سب نے ہمیں پاگل کہنا شروع کر دیا۔ ہم بھی پاگل بن گئے اور وہاں سے بھاگ آئے۔ ہم ہم کو سکول چھٹنے کا بہت دکھ ہے بیگم صاحب''

اس کی آنکھیں شدت سے سرخ ہو رہی تھیں اور انجانے میں میرے گال بھی بھیگ رہے تھے۔

اس دن کے بعد تو سبھی اس کا بے حد خیال رکھنے لگے زندگی اپنی ڈگر پر چلی جا رہی تھی، لیکن کہتے ہیں نا کہ انسان کو بھی ایک حالت میں قرار نہیں۔ بہت سکون بھی اسے بے کل کر دیتا ہے اور وہ بے سکونی کی تلاش میں جان بوجھ کر نکل کھڑا ہوتا ہے۔ یعقوب دوسرے تیسرے روز تھوڑی دیر کی چھٹی لے کر کہیں غائب ہو جاتا تھا۔ کئی مرتبہ پوچھا مگر ٹال گیا۔

ایک دن مجھے یونہی ابال سا آ گیا۔ کہ ہم تو اسے بغیر کسی گارنٹی کے گھر بار سونپے بیٹھے ہیں اور یہ ہے کہ کچھ بتاتا ہی نہیں۔ بھلا ہم اتنے بے اعتبارے ہیں؟

کوئی انسان کتنا ہی اعلیٰ ظرف کیوں نہ ہو۔ اس کے اندر کہیں نہ کہیں ایک چھوٹا انسان بھی چھپا بیٹھا ہوتا ہے۔ جو اپنی بڑائی اپنی ستائش اور اپنے احسانات کا بدلہ ضرور چاہتا ہے۔ چاہے وہ الفاظ کی شکل میں ہی کیوں نہ ہو۔

یعقوب کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے غصے کا ناگ میرے اندر دھرنا مار کر بیٹھ گیا۔ جو وقتاً فوقتاً پھنکارتا۔ اس پھنکار کی آواز باہر آتی تو یعقوب گھبرا جاتا۔

مَیں اپنے آپ کو سمجھاتی، بھلا اس نیم پاگل محروم سے انسان سے میرا کیا مقابلہ؟ مَیں اس سے کیوں ٹکر لے رہی ہوں۔ مگر تریا ہٹ بھی تو کوئی چیز ہے نا۔ اب اکثر و بیشتر اس کے کاموں اور سستی پر تنقید ہونے لگی بچے اور اظفر خاموش تماشائی بنے رہتے۔ مجھے شرمندگی بھی محسوس ہوتی اپنے آپ میں۔۔۔ جانے میں کیا چاہتی تھی۔ شاید اس کی بزدلی پر مجھے غصہ آتا تھا۔ مَیں لاشعوری

طور پر اسے مضبوط بنانے کی کوشش میں مصروف تھی (یہ اظفر کا خیال تھا) وجہ کچھ بھی ہو رحم اور غصے کے جذبات مجھے مغلوب کیے رکھتے اور جھنجھلاہٹ سے میرا سر دکھنے لگتا۔

اس پر طرہ یہ کہ ایک رات T.V دیکھتے دیکھتے خبرنامے پر یعقوب نے کچھ ایسا تبصرہ دیکھا کہ سبھی چونک پڑے، وہ بڑبڑا رہا تھا۔

''زندگی دائروں کے خول میں کیوں سمٹ جاتی ہے یہ سورج کی گردش کی کیوں تابع ہے ازل سے ابد تک ایک ہی دائرے میں گھوم رہی ہے! یہ سارا نظام چوکور یا مستطیل بھی تو ہو سکتا تھا۔ آخر یہ سارا چکر گول کیوں ہے؟ ہاں چکر جو ہوا اور چکر تو ہوتا ہی گول ہے'' پھر وہ خود ہی ہنس پڑا اپنی سوچ کو جواب دیتے ہوئے۔

''آنکھوں کی پتلیاں بھی تو گول ہیں جو دُنیا دکھاتی ہے سوچ کا دائرہ بھی تو ایک مقام سے شروع ہو کر واپس اسی مقام پر آ کر ختم ہو جاتا ہے'' وہ خلا سے باتیں کرتا رہا۔ ناممکن قطعی ناممکن یہ یعقوب نہیں کوئی اور بول رہا ہے۔۔۔ اگر یہ یعقوب ہے تو پھر یعقوب ایک ڈرامہ ہے فراڈ ہے بہروپیا ہے یہ ہم سب کا متفقہ فیصلہ تھا۔ جو یعقوب نے سب کی نگاہوں میں پڑھ لیا۔

اگلی صبح خاصی بوجھل سی تھی۔ ہم سب اپنی اپنی جگہ قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ یعقوب بالکل خاموش کام میں مصروف رہا، سہ پہر کو اچانک وہ کچھ بتائے بغیر غائب ہو گیا۔ کافی دیر گزر گئی تو مجھے وسوسوں نے آن گھیرا۔

''اظفر یہ کسی گروہ کا آدمی نہ ہو۔ کوئی جاسوس وغیرہ۔۔۔ ارے نہیں بابا ہو سکتا ہے کہ یہ اتنا قابلِ رحم نہ ہو جتنا دکھائی دیتا ہے مگر C.I.A کا ایجنٹ تو نہیں لگتا۔'' اظفر نے حسبِ معمول میرے خدشات کو کم کرنا چاہا۔

''دہشت گرد ایسے ہی تو ہوتے ہیں جھلے ملنگ جو بظاہر بالکل بے ضرر دکھائی دیں۔'' میری فکر بڑھتی جا رہی تھی ''ہو سکتا ہے ڈاکوؤں کے کسی منظم گروہ کا بندہ ہو، چوری چکاری کے لیے بھید لیتا ہو گھروں کے۔''

میں بے حد پریشان تھی۔ اس شام بارش بھی اس شدت سے برس رہی تھی کہ جیسے آج ہی

آسمان اپنے سارے آنسو بہا دے گا۔ خوف کے ساتھ ساتھ رحم کی لہر بھی کہیں اُبھرتی دل میں۔۔۔ نجانے بے چارہ کہاں ہو گا اس موسم میں پتہ نہیں کس مصیبت میں نہ پھنس گیا ہو۔

رات گیارہ بجے میری بے چینی اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ بچے کب کے سو چکے تھے مگر ہم دونوں یعقوب کے انتظار میں جاگ رہے تھے۔ آخر کار ضبط کا یارا نہ رہا۔

''اظفر ہے تو یہ غیر اخلاقی حرکت لیکن میں آج ذرا اس کے سامان کی تلاشی تو لوں کچھ تو سراغ ملے گا اس کا'' مَیں نے ان کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور یعقوب کی کوٹھڑی کی جانب چل دی۔ دروازہ نیم وا تھا پہلے تو میں جھجکی ''یعقوب'' مَیں نے ہولے سے پکارا کوئی جواب نہ پا کر مَیں نے اندر داخل ہو کر سوئچ آن کر دیا۔ دھیمی سی روشنی میں اس کا بے ترتیب بستر اور اکلوتا سوٹ کیس یعقوب ہی کی طرح تنہا اور پر اسرار دکھائی دے رہے تھے۔

مَیں نے سوٹ کیس کا جائزہ لیا China کے مضبوط تالے نے میرے شکوک کو تقویت بخشی۔ تجسس کے ہاتھوں مغلوب ہو کر اظفر بھی میرے پیچھے چلے آئے تھے، اُنھوں نے خاصی تگ و دو کے بعد تالا توڑ ڈالا۔ میرے دل میں عجب کھد بدی ہو رہی تھی اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ مَیں سانس روکے کھڑی تھی کسی دھماکے کی۔۔۔۔ کسی ہنگامے کی منتظر۔۔۔۔۔ سوٹ کیس کھلا تو حیرت کے پہاڑ مجھ پر ٹوٹ پڑے اگر اس میں سے کوئی لاش برآمد ہوتی تو شاید میں اتنی حیران نہ ہوتی، جتنی میں ایک ٹرانسسٹر پھٹے پرانے ایک جوتوں اور صابن کی ایک عدد ٹکیا کو دیکھ کر ہوئی۔

لیکن مَیں مایوس نہیں تھی ''اظفر یہ مجرم اتنے بھولے تھوڑا ہی ہوتے ہیں کہ کوئی سراغ چھوڑیں ذرا اچھی طرح تلاشی لینا۔''

مَیں نے خود بھی سوٹ کیس کا کونہ کونہ کھنگال ڈالا ایک جانب سے سوٹ کیس کا اندرونی حصہ کچھ ابھرا سا محسوس ہوا میرے تجسس کی تسکین ہونے لگی بے تابی سے وہ جگہ ٹٹولی تو کریم کی ایک پرانی ڈبیہ ہاتھ لگی میرا چہرہ کامیابی کے احساس سے ٹمٹمانے لگا۔ اظفر کی ملامت آمیز نگاہوں میں بھی اب دلچسپی ہچکولے کھانے لگی۔

ڈبیا کھولی تو ایک پرانی Black & white تصویر، جس کے نقوش بھی مدھم پڑ چکے تھے

میرا تمسخر اڑا رہی تھی غالباً یعقوب کی ماں کی ہوگی۔

ساتھ ہی پرانی کاپی کا ایک بوسیدہ صفحہ تہہ شدہ پڑا ملا، شاید کوئی سر بستہ راز، اُمید نے پھر سر ابھارا کاغذ کی تہیں کھولیں تو مجھ میں برداشت کی طاقت نہ رہی۔

اظفر کے کندھے پر سر رکھے میں پھوٹ پھوٹ کر جانے کتنی دیر روتی رہی۔

اس کاغذ کی تحریر آج بھی میرے دل ودماغ میں گولیوں کی سی گونج اور سنسناہٹ بھر دیتی ہے۔

کاغذ پر انتہائی خوشخط لکھائی میں لکھا تھا

"بابا آم لا جھوٹ نہ بول بک بک مت کر"

اور نیچے سترہ سال پرانی تاریخ کے ساتھ کسی استاد کے دستخط تھے اور بڑا بڑا سرخ روشنائی میں "شاباش" درج تھا۔

☆☆☆

کمی کمین

"سپٹر سپٹر" کی آواز کافی دیر سے گھر بھر میں گونج رہی تھی۔ مَیں گاہے بگاہے نظر اٹھا کر دروازے سے باہر دیکھ لیتا تھا۔ دُھوپ سامنے والی دیوار سے دبے پاؤں اتر کر اب سامنے والے برآمدے مَیں پاؤں پسارے بیٹھی تھی۔ بے ترتیب کرسیاں اور گدلا چپس بتا رہا تھا کہ "جنتے" ابھی یہاں تک نہیں پہنچی۔

اوائل گرمیوں کی اداس اونگھتی سی صبح درختوں پر چڑیوں اور کوؤں کا شور۔ لان کا سبزہ ابھی پورے جوبن پر نہیں تھا۔ کہیں کہیں پیلی مرجھائی گھاس پر چمکتی دُھوپ۔ بڑے عرصے بعد گھر میں صبح کا یہ منظر میں دیکھ رہا تھا۔ ورنہ تو دفتر جانے کی جلدی ناشتے کی جلدی تیاری کی جلدی میں فرصت ہی نہ ملتی تھی کہ صبح کبھی تسلی سے اٹھوں۔۔۔ چھٹی کا آدھا دن تو سو کر گزرتا تھا۔

مَیں نے ذرا آگے ہو کر جھانکا۔ ملک انکل کی انیکسی کا دروازہ ابھی تک بند تھا۔ کیا مزے ہیں؟ مَیں نے منہ پھاڑ کر جماہی لی۔ اچھا ہوتا اگر امی ابو کے ساتھ کراچی چلا جاتا، مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ ان کے جاتے ہی بخار صاحب آن لیں گے اور میں یہاں سارا دن منظور سے جھک مارتا اور جنتے سے صفائیاں کرواتا رہوں گا۔

چلو ایک لحاظ سے تو اچھا ہی ہوا۔ صبا باجی کی شادی میں کون سا کوئی نیا کام ہونا تھا۔ امی کے

اصرار کے باوجود دل نہ مانا۔ ایک تو گرمی۔۔۔ اوپر سے شادی کا ہنگامہ اور سب سے بڑا مسئلہ خواتین۔ جی ہاں خواتین! خوش قسمتی سے کھاتے پیتے گھر کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ سب سے پہلے مختلف اقسام کی ''آنیٹز'' گھیر لیتی ہیں۔ سوالوں کی بوچھاڑ پسند، ناپسند، عہدہ، تنخواہ، مراعات وغیرہ کی تفصیل کے بعد نہایت پراسرار طریقے سے نہ جانے کہاں کہاں سے انواع واقسام کی کزنز کا ایک نڈی دل میری طرف بڑھنے لگتا ہے۔ ہر سائز ہر عمر اور ہر برانڈ کی حسینائیں اپنی اپنی ذات کا جادہ جگانے لگتی ہیں۔ اپنے تئیں ہر کوئی دوسری کو اپنی سوتن جان کر خونخوار نگاہوں سے دیکھ رہی ہوتی ہے۔ جب کہ میں فی الحال شادی اور وہ بھی فیملی میں توبہ۔۔۔ کوئی ارادہ نہیں۔

امی جاتے جاتے ہدایات کا ایک پلندہ میرے سر پر رکھ گئی تھیں۔ ''بازار کا کھانا مت کھانا۔ فریزر میں کباب اور روسٹ وغیرہ پڑا ہے گرم کروا لینا منظور سے۔ شام کو گھر جلد آ جایا کرنا۔ جاتے وقت چابیاں ملک انکل کے حوالے کر جایا کرنا وہ جنتے سے صفائیاں کروا لیں گے'' وغیرہ وغیرہ۔

اور میں نے حسبِ روایت اس پلندے کو اٹھا کر دماغ کے کسی ایسے خانے میں رکھ دیا، جہاں سے وہ مجھے نظر نہ آ سکے۔ چند دن ہی میں گلا خراب اور پھر بخار۔ بخار کے سبب دفتر سے چھٹی اور چھٹی کے باعث ہم منظور اور جنتے کے رحم وکرم پر۔

وہ تو بھلا ہو ملک انکل کا کہ کسی بہتر ذی رُوح سے بات کرنے کو مل جاتی تھی۔ ملک انکل ابو کے دور دراز کے رشتے دار ہیں۔ جوانی میں بیوی کی موت کے بعد سے جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتے رہے۔ پچھلے کئی برس سے ہمارے ہاں مقیم ہیں اپنی ذات میں گم نہ کسی کو ان سے شکایت نہ کسی سے ان کا گلہ۔۔۔ بنک میں جمع پونجی رکھے بیٹھے ہیں۔ ابو ان سے انیکسی کا کرایہ تو لیتے نہیں۔۔۔ سو وہ بھی بار احسان کی وجہ سے گھر کے باہر کے کئی مسائل حل کر دیتے ہیں۔ ان کی موجودگی ہم سب کے لیے طمانیت کا باعث ہے۔ فارغ وقات میں گپ شپ کے لیے ''باؤ جی آپ کے کمرے وچ جھاڑو لگا دیاں'' جنتے میرے سر پر کھڑی تھی۔''

''ہاں جلدی کرو مگر'' میں کتاب اٹھائے برآمدے میں جا بیٹھا۔ کتاب میں عجیب سی کہانی تھی۔ حسین مگر غیریب ملازمہ۔ عاشق مزاج امیر زادہ۔ قہقہوں اور آنسوؤں سے بھری کہانی اور

انجام جانے کیا تھا؟ میں تو غریب مگر پری چہرہ ملازمہ کے حلیے کو پڑھ رہا تھا۔ اچانک میں نے جنتے کے سراپا کا موازنہ کہانی کی ہیروئن سے کرنا شروع کر دیا۔ کتاب والی ملازمہ کا حسن تو پھٹے کپڑوں سے جھلک رہا تھا اور اس کا چہرہ چاند سا سرخ وسفید وغیرہ تھا۔ جب کہ جنتے کو آج بغور دیکھنے پر پتہ چلا کہ وہ بے چاری اور کچھ بھی نہیں محض ایک عورت ہے۔ سانولے چہرے پر گزارا سے نقوش چکنے چپڑے بالوں میں رنگ دار پراندہ کالے کالے بے ہنگم سے پاؤں میں Cheap سے چپل، سوکھے کالے بازوؤں میں انتہائی گھٹیا قسم کی چوڑیاں۔

مجھے بار بار دیکھتا پا کر وہ جھینپ سی گئی۔ پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے منہ دوسری طرف کر لیا اور جھاڑو کے ساتھ ساتھ اس کا بدن بھی زور زور سے ہلنے لگا۔ مَیں گڑبڑا سا گیا۔ جانے وہ کیا خیال کرے؟ مَیں نے بات بنانے کو یونہی سوال داغ دیا۔

''جنتے تیرے ماں باپ کدھر رہتے ہیں۔''

''او جی ہم گریبوں کے مائی باپ تو آپ لوگ ہیں جی۔'' بڑا زمانہ شناس اور گھاگ جواب تھا۔ ''خاوند چارپائی سے لگا پڑا ہے۔ پرانا روگی ہے شیدا'' اس نے میری معلومات میں اضافہ کیا اور ساتھ ہی ٹیپ آن ہو گیا پھر نہ جانے وہ کیا کیا اور کب تک بولتی رہی۔ حتی کہ منظور نے آ کر اسے جھاڑا۔

''کیوں صاحب کا دماغ کھا رہی ہے۔ وہ تو پہلے ہی بیمار پڑے ہیں۔''

''آئے ہائے۔۔۔ مینوں کیا پتہ تیل پادوں سروچ باؤ جی۔'' اس کی گلابی اردو پر میں یونہی ہنس پڑا اور وہ سچ مچ گلابی ہو گئی۔

وہ تو اچھا ہو گیا کہ ملک انکل آ گئے اور میری جان چھٹی ورنہ جنتے تو شاید آج میری پوری طرح تیمارداری کر کے ہی جاتی۔

ملک انکل سے ان کی جان جاتی تھی۔ ان کو دیکھے ہی اسے جیسے سانپ سونگ جاتا۔ جھولتا بدن ڈھیلا بے جان پڑ جاتا۔ دنداسہ لگے نارنجی ہونٹوں سے جھانکتے پہلے پہلے دانت اندر چھپ جاتے اور وہاں سے ٹلنے کی کرتی۔ ملک انکل کی پیشانی پر ناگواری کی واضح لکیر نظر آتی۔ میں اپنے

آپ میں خجل سا ہو جاتا کہ میری یہ بے ضرری شرارتیں کہیں جنتے کو زیادہ خوش فہمی اور ملک انکل کو غلط فہمی میں مبتلا نہ کر دیں۔

ظاہر ہے وہ میرے باپ برابر تھے اور نہ جانے میرے بارے میں کیا سوچتے۔۔۔ ایسے میں وہ کن اکھیوں سے میرا جائزہ لیتے۔ مرے قدموں سے جاتی جنتے پر قہر آلود ڈالتے اور جلد ہی کسی نہ کسی بہانے اٹھ جایا کرتے۔

بہر حال اب کچھ دن تو گزارنے تھے جیسے تیسے۔ سو شام کو دوستوں کی محفل سجا لیتا تھا۔ ذرا ہنگامہ اور شغل ہو جاتا۔ صبح جنتے آکر تمام بے ترتیبی کو سنوارتی۔ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی کہیں سے کشن اٹھا رہی ہوتی اور کہیں سے جوتے۔ مَیں اس کی حرکات کو دلچسپی سے دیکھتا رہتا اور زیرِ لب مسکراتا رہتا۔ جانے وہ پاگل کیا سمجھی میں نے نوٹ کیا کہ وہ اپنی دانست میں خوب بن سنور کر آئی ہے۔ آنکھوں میں سرمے کی یہ لمبی لمبی دھاریں۔ دنداسہ مل کر سیاہ ہونٹوں کو سرخ کرنے کی ناکام کوشش میں بے چاری کا حلیہ مزید بگڑ جاتا۔ گہرے سانولے رنگ میں نارنجی رنگ کی آمیزش عجیب سا تاثر چھوڑتی۔ چیختے چلاتے رنگوں کے کپڑے البتہ سٹائلش ہوتے۔ اترن لگتی تھی مختلف گھر والیوں کی۔ بالوں پر تیل کی مقدار مزید بڑھ گئی تھی۔ چکنائی کے باعث چمکتا ماتھا مزید سیاہ نظر آتا۔ اپنے پراندے کو جھلاتے جھلاتے اس کا بدن دہرا ہو جاتا۔ جھاڑو دیتے وقت وہ کن اکھیوں سے میرے جانب دیکھتی رہتی۔ میں سویا بن جاتا یا کتاب پڑھنے لگتا تو وہ جھاڑو زور زور سے زمین پر پٹختی۔ میری توجہ پاتے ہی وہ جھاڑو کو کم اور بدن کو زیادہ ہلانے لگتی۔ خواہ مخواہ ہی میرے کمرے کی ہر چیز کو کئی کئی بار دوپٹے سے صاف کیے جاتی۔ حتیٰ کہ میں ڈسٹرب ہونے لگتا۔

''جنتے جلدی کام ختم کرو اور بھاگو یہاں سے۔۔۔'' میری ڈانٹ سن کر وہ عجیب سی نظروں سے میری جانب دیکھتی اور بوجھل بوجھل قدموں سے کمرے سے نکل جاتی، لیکن اگلی صبح پھر وہی چھمک چھلو سٹائل لیے نئی سج دھج کے ساتھ آن موجود ہوتی۔

''جنتے'' آج کل ہم دوستوں کی محفل کا Hottet issue تھی۔ خوب قیاس آرائیں ہوتیں۔ شوخ مذاق چلتے اور بات ہنسی میں آئی گئی ہو جاتی۔

اس دن طبیعت قدرے بہتر تھی مَیں واش روم میں نہانے گھس گیا تولیہ باندھے نکلا تو کمرے میں جنتے حسبِ معمول صفائی میں مشغول تھی۔ میں جھنجھلا گیا'' کم از کم دروازہ تو Knock کر دیا کرو۔ منہ اٹھائے چلی آتی ہو اندر''

اس نے سہم کر مجھے دیکھا نا قابلِ فہم سی نظریں تھیں۔۔۔ حسرت آمیز۔۔۔ وہ پڑپڑ مجھے دیکھتی رہی۔

''جنتے کیا بات ہے؟'' میں نے نرمی سے پوچھا وہ دیکھیے گئی۔۔۔ ایک ٹک۔۔۔ پھر اچانک جیسے خواب سے جاگی ہو۔

''کچھ وی تاں نئیں باؤ جی۔۔۔ کچھ وی نئیں۔۔۔'' اور باہر چلی گئی۔

مَیں کچھ چور سا محسوس کرنے لگا تھا خود کو۔ انجانے میں شغلاً Observe کرنے کی عادت نے نہ جانے اس بیچاری کے کن خوابیدہ جذبوں کو جگا دیا تھا۔ مَیں سوچتا کہ اب اسے نظر انداز کروں گا، کافی شرارتیں ہو چکیں۔ ویسے بھی ان کمین لوگوں کا کیا بھروسہ بلا۔ معصوم سی کسی دل لگی کو یہ لوگ جانے کس قسم کے الزام میں بدل دیں۔ ذرا سی لفٹ کراؤ تو سر چڑھنے لگتے ہیں یہ لوگ کی انھیں بھلا کسی کی عزت بے عزتی کی کیا پرواہ۔

لیکن خود سے کیا یہ وعدہ وفا نہ ہو سکا۔ صبح ہی صبح وہ متورم پپوٹوں کے ساتھ آن موجود ہوئی۔ چہرے پر جا بجا نیل پڑے ہوئے۔ آج نہ وہ خود ساختہ سج دھج تھی اور نہ الٹا سیدھا میک اپ۔ ایک سوگواری کا عالم تھا وہ دھیرے سے آ کر قالین پر بیٹھ گئی اور اپنے میلے میلے ناخنوں کو کھرچنے لگی۔

''ارے یہ کیا؟ کس نے پیٹا ہے تجھے جنتے۔۔۔ مَیں نے پوچھا'' خاوند نے جی۔۔۔''

آنسو اس کے سوکھے سانولے گالوں پر جھر جھر بہنے لگے۔

''کیوں آخر۔۔۔؟ مجھے اس کی حالت پر واقعی ترس آنے لگا ٹھیک ہی تو کہتا ہے جی وہ ٹھیک تو مارا ہے اس نے مجھے۔''

''کیا کہتا ہے وہ اور کیا ٹھیک ہے؟ مَیں واقعی اس کی منطق سمجھ نہیں پا رہا۔

''وہ جی۔۔۔ وہ۔۔۔'' وہ جھجک سی گئی۔ مَیں رات بھر گھر سے باہر جو رہی تھی اور پھر آئی بھی

خالی ہاتھ۔اس کی دوائیاں اس کا نشہ کیسے پورا ہوتا۔۔۔ مارنا تو تھا، نا جی نہ مارتا تو کیا کرتا بے چارہ۔۔۔''

یہ کہتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''اوہ مائی گاڈ۔۔'' میرا دل رنج وغم سے بھر گیا۔ بے چاری عورت اپنی ذلت اپنی توہین اپنی پامالی کا کوئی احساس نہیں۔۔۔ رنج ہے تو اس بات کا کہ خاوند کی دوائیں اور نشہ کیوں کر پورا ہوگا۔ میرا وجود سنسنا اٹھا۔ اتنا ظلم اتنی گراوٹ۔

''لیکن تمھارے خاوند کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا؟ میں غیر ارادی طور پر کہ گیا۔''

''اونوں کیا اعتراض ہونا جی۔۔۔ خالی پیٹ روٹی مانگتا ہے اور عجت روٹی بنا کر پیٹ میں نہیں ڈالی جا سکتی ہے'' کتنا بڑا اور بھیانک سچ اس ''چھوٹی اور کمین'' عورت کے منہ سے نکلا تھا چند ثانیے ایک کربناک خاموشی چھائی رہی۔ وہ وقفے وقفے سے اپنے میلے دوپٹے کا پلو کبھی آنکھوں پر رگڑتی اور کبھی ناک پر۔ ڈھیروں آنسو بہہ جانے سے جیسے وہ ہلکی پھلکی سی ہو گئی تھی۔ ہلکی ہلکی بے ضرر سی سسکیاں تھیں۔ جو نہ اس سماج کا کچھ بگاڑ سکتی تھیں۔ نہ میرا اور نہ جنتے کے شوہر کا۔

مجھے بالکل سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں اسے کیسے تسلی دوں۔ ''تو پھر آج رات تم خالی ہاتھ کیوں آئیں۔۔؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی یہ بے تکا مہمل سا سوال میرے لبوں سے پھسل پڑا۔ یونہی!

اس نے نظر بھر کر مجھے دیکھا اف اتنی زخمی نگاہیں۔ اتنی تڑپ اتنی جلن اتنی دکھن؟ وہ جو پڑھتے تھے، عورت کی نگاہ میں طاقت کی کہانیاں۔ آج سچ معلوم ہونے لگیں۔ جانے کیا تھا ان نظروں میں کہ میں اندر تک لرز گیا۔

''اَج کی رات صرف اَج رات ہی تو میں نے اپنی مَرجی سے باہر گزاری تھی جی۔ سچے دل کے ساتھ جی۔ کسی لالچ کے بغیر، کسی حاجت کے بغیر۔ اپنے جی کے واسطے۔''

اَج پہلی وار میں نے ایک رات ملک صاحب کے کمرے کی بجائے آپ کے برآمدے میں گزاری۔ آپ کی خدمت کرنے کو جی چاہتا تھا جی، آپ بیمار جو تھے میں اس قابل کتھے کہ آپ کا سر دباتی۔ سروچ تیل پاتی۔ پاؤں دباتی بس باہر بیٹھی دعا کرتی رہی کہ شاید کسے ویلے آپ کو میری

لوڑ پڑ جائے۔ کوئی کام مجھ تک آ جائے کوئی پانی۔ کوئی چاء۔۔۔'' اس کا گلا رندھ گیا۔

اور میں زمین میں دھنستا جا رہا تھا۔ اندر ہی اندر۔۔۔ نیچے ہی نیچے۔

☆☆☆

بھرم میری انا کا۔۔۔

میری نظر اچانک ہی اس پر پڑی تھی۔ پہلے تو لگا کہ شاید کوئی دھوکا ہوا ہے۔ میں نے بغور دیکھا۔۔۔ وہی تھی ہاں بالکل وہی۔۔۔ وہی چال۔۔۔ اسی طرح سر کو ہلکا سا ٹیڑھا کر کے چلنے کا انداز۔۔۔ چھوٹے چھوٹے تیز قدم، جن کی دھمک میرے دل پر محسوس ہوا کرتی، مگر کپڑوں کا سٹائل کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔ کمر کا کٹ تو وہی تھا جسے دیکھ کر میرے اندر جانے کیوں شدّت سے یہ خواہش اُبھرا کرتی تھی کہ مَیں اس کی کمر میں کبھی چوڑی تو پہن کر دیکھوں۔۔۔ میری یہ Stupid سی خواہش سن کر وہ اتنا ہنسی تھی کہ مَیں شرمندگی کے مارے دو دن اس سے کٹا کٹا پھرا تھا۔

عمر کی کچھ بالائی جسم پر بڑی نفاست سے یوں سج گئی تھی جیسے ایک خوبصورت کیک پر کریم کی کئی تہیں جمنے کے بعد بھی کیک کی اصل بناوٹ بدلتی نہیں۔ بلکہ اگر مَیں غلطی پر نہیں ہوں تو گداز بدن کی بنٹی زیادہ پر کشش لگ رہی تھی۔ پہلے والی بنٹی سے بھی کچھ زیادہ۔۔۔ یا شاید میری عمر کا تقاضا یہی تھا۔ وہ مختلف سٹالز پر پھرتی رہی۔ اسی پرانے انداز میں بھاؤ تاؤ کرتی اور آگے بڑھ جاتی۔ مَیں لاشعوری طور پر ہی اس کے پیچھے چلتا گیا۔۔ اس وقت میں بھول گیا تھا کہ میں 46 برس کا ہو چکا ہوں اور ایک ذمہ دار انسان کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہوں۔ مجھے لطف آ رہا تھا۔ ایک Thrill سی تھی جس نے مجھے گھیرا ہوا تھا۔۔۔ جیسے Time machin کی کوئی کل دب گئی تھی

اور مَیں ماضی کے خوبصورت hanging Gardens میں تتلیوں کے تعاقب میں مگن تھا۔ دفعتہً وہ ایک سٹال پر رک گئی۔۔۔ مَیں انجانے میں شاید اس کے بہت قریب آ گیا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا ایک ثانیے کو ٹھٹکی۔۔۔ سٹال والے سے مخاطب ہوتے ہوئے وہ یکدم مڑی مجھے دیکھا۔۔۔ ’’سہیل‘‘ وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائی آنکھوں میں مشکوک سی خوشی تھی۔

’’کیسے ہو‘‘ مَیں مسکرا دیا۔ وہ ویسی ہی تھی۔ بالکل ویسی۔

’’تم یہاں کیسے؟‘‘ وہ کفیوژ سی لگ رہی تھی۔

’’ہاں مَیں واپس آ گیا ہوں جاپان سے۔ بس دل اکتا سا گیا تھا۔ تنہائی کا عذاب سہتے سہتے تھک سا گیا تھا۔۔۔‘‘ مَیں نے اسے وقفہ دیا کہ وہ خود کو سمیٹ لے۔

’’ذرا بھی تو نہیں بدلے تم۔۔۔ ہاں مگر باہر سے‘‘۔۔۔ وہ شرارت سے ہنسی۔۔۔ وہی پھلجھڑی سی ہنسی جو میرے پور پور میں چنگاریوں سی بھر دیا کرتی تھی۔ میرا بدن اینٹھ گیا۔ شاید ایک لمبے عرصے تک کی محرومی نے میری پوروں کو بے حس کر دیا تھا۔

’’ہاں یہ صاف چندیا اور بھاری توند۔۔۔ عقلمندی اور امارات کی سند کے طور پر ساتھ لیے پھرتا ہوں۔۔۔‘‘

’’اور سند بھی جعلی۔۔۔‘‘ اس کی شوخی اور حاضر جوابی کا عالم وہی تھا۔

’’تو کیا۔۔۔‘‘ مَیں نے سوچا اور میرے دل پر اوس سی گرنے لگی۔

’’کہاں کھو گئے۔۔۔‘‘ اس نے ہاتھ میری آنکھوں کے آگے لہرایا۔ ’’چلو وہاں چاٹ کھاتے ہیں۔‘‘ بنٹی نے مینا بازار کے درمیان لگے رنگ برنگ اشتہا انگیز ڈیکوریشن والے سٹال کی جانب اشارہ کیا۔

’’یہاں کب سے ہو اور کیا کر رہے ہو‘‘۔۔۔ وہی پرانی عادت۔۔۔ چند لمحوں میں بال کی کھال اُتارنے کا شوق۔

’’میری انکوائری ہی کرتی رہو گی یا کچھ اپنا پتہ بھی دو گی۔۔۔‘‘ مَیں جواب گول کر گیا۔۔۔ میرا لہجہ جانے کیوں ٹوٹا سا تھا۔

بجائے ایک سرشاری سی بھر دی۔ مَیں نے ایک ناکام سی کوشش کی اپنے چہرے پر دُکھ کو سجانے کی۔۔۔ لیکن آنکھوں کے کناروں سے چھلکتا اطمینان شاید چہرے کے صحرا پر بہہ نکلا تھا۔۔۔ اس نے غور سے مجھے دیکھا اور سر جھکا لیا۔۔۔

''بیٹی تو بہت پیاری ہوگی۔۔۔ بالکل تم پر ہوگی۔۔۔''مَیں نے اپنی کمینگی کو چھپانے کی ایک اور ناکام کوشش کی۔۔۔

''پتہ نہیں۔۔۔ مجھے تو پیاری ہی لگتی ہے۔۔۔ ماں ہوں نا۔۔۔''

وہ مسکرائی۔ ایک روشنی سی اس کے چہرے پر بکھر گئی۔

''شاید یہی اس کی زندگی کی واحد خوشی ہو۔۔۔''مَیں نے سوچا۔ بنٹی کی کمزوری مَیں جانتا تھا۔ جب بھی مستقبل کی بات ہوتی تھی تو بنٹی ہمیشہ ایک پیاری سی ذہین سی نٹ کھٹ بیٹی کی آرزو کرتی۔

''مَیں چاہتی ہوں اپنی بیٹی کو اتنا پیار دوں کہ ذہنی طور پر مفلوج یہ سوسائٹی چونک پڑے۔ جہاں بیٹی ایک بوجھ ہے، ایک گالی ہے۔ بیٹی کو تو جانے کن اجنبی زمینوں میں دوبارہ نمو کا سفر شروع کرنا ہوتا ہے۔۔۔ کون جانے وہ ہری بھری شاخوں میں ڈھلتی ہے یا سوکھی ڈال میں۔۔۔'' مجھے اس کا ایک ایک حرف یاد تھا۔

''Cangratulations تمھارا یہ خواب تو پورا ہوا۔۔۔''مَیں نے خود کو بے حد خلوص نیت کے ساتھ کہتے سنا۔

اسے مل کر فوری طور پر میرے احساسات، جو ایک برف سی جم گئی تھی وہ اب پگھلنے لگی تھی۔ مَیں بنیادی طور پر ایک خود غرض انسان ہوں اور بنٹی تو شاید بنی ہی خوشیاں بانٹنے کے لیے تھی۔ اپنی زندگی سے اس کا نفی ہو جانا میرے لیے Next to Impossible تھا۔ اس کے بچھڑ جانے سے میری انا کی بھری بوتل بھی جیسے پچک گئی۔

''بنٹی۔۔۔ بنٹی ایک نامانوس سی گھمبیر آواز سماعت سے ٹکرائی ''بھئی تم یہاں ہو اور مَیں پوری دُنیا میں تمھیں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔۔۔''

مَیں نے دُھندلی نظروں سے ایک سمارٹ سے ہنستے مسکراتے چہرے والے اجنبی کو دیکھا۔۔۔ ''دیکھو کتنی خوبصورت شال لی ہے تمھارے لیے۔۔۔''اس نے ایک پیکٹ بنٹی کو پکڑایا ''فراز کو جلدی جانا تھا۔ سو مَیں فارغ ہوتے ہی سیدھا تمھیں لینے آ گیا۔۔۔''اس کی مسکراتی نگاہوں میں بنٹی پر نثار ہو جانے کی کیفیت عیاں تھی۔۔۔ ساتھ میں ایک بے حد خوبصورت سی بچی تھی، جو آتے ہی بنٹی کے گلے میں جھول گئی تھی۔

''رضا ان سے ملو۔۔۔ سہیل میرے کلاس فیلو تھے یونیورسٹی میں۔ آج اچانک ہی بنٹی نے تعارف کروایا تو۔۔۔ اور ہم ادھر گپ شپ لگانے بیٹھ گئے۔۔۔

بنٹی نے تعارف کروایا تو۔۔۔ اپولو میری جانب مڑا۔

''اوہ آئی ایم رئیلی سوری۔۔۔ مجھے خیال ہی نہ رہا۔۔۔ اصل میں یہ بنٹی جو ہے نا۔۔۔ ہم باپ بیٹی کے لیے آکسیجن کی طرح ہے۔۔۔''

رضا نے گرم جوشی کے ساتھ میرے مردہ مچھلی سے ہاتھ کو تھامتے ہوئے اپنی بے چینیوں کا اظہار کیا تو میرے اندر جیسے کچھ ڈھے سا گیا۔۔۔''

''نو پرابلم۔۔۔ مَیں سمجھتا ہوں۔۔۔''مَیں نے خود کو مردنی سے کہتے سنا۔ بنٹی نے نظریں چرا لیں۔

مَیں نے کہا تھا کہ وہ میری چھوٹی چھوٹی خواہشات کا بھی خیال رکھا کرتی تھی۔

☆☆☆

بنٹی نے غور سے میری آنکھوں میں جھانکا۔ اندر تک اترتی ہوئی وہی ذہین نظریں ایک گہرا سانس لے کر اس نے کرسی کی پشت سے سر ٹیک لیا۔

''میری شادی ہو چکی ہے اور ایک عدد پیاری سی بیٹی کی ماں ہوں۔۔۔'' اس نے ایک کھوکھلا سا قہقہہ لگایا۔

''خوش ہو۔۔۔؟'' مَیں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا۔۔۔ وہ نظر چرا گئی اور میز پر پڑی نمک دانی سے کھیلنے لگی۔

''تم خوشی کسے کہتے ہو۔۔۔''؟ اس نے تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھایا اور پوچھا۔۔۔ کوئی جواب نہ پا کر خود ہی ہولے سے کہنے لگی۔

''لگی بندھی روٹین۔۔۔ دُنیاوہ حوالوں سے ایک اچھی اور کامیاب زندگی ہی اگر خوشی کا نام ہے تو مَیں بہت خوش ہوں۔۔۔''

''یعنی۔۔۔'' میرے اندر جیسے ایک فوارہ سا پھوٹنے لگا۔ مَیں نے خود پر نفرین بھی بھیجنے کی کوشش کی، مگر اس کے چہرے پر اداسی کے پڑاؤ کے پس منظر میں مجھے اپنا سنگِ میل نظر آنے لگا تھا۔

''شوہر کیسا ہے''؟ کمینہ سا سوال نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لبوں سے پھسل ہی پڑا۔ اس نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ چند ثانیے گرمیوں کی اونگھتی دوپہر جیسے بھاری ہو گئے۔

''یہ تم اتنے لاپرواہ کیوں ہو گئے ہو۔۔۔ یہ لباس۔۔۔ یہ کلر میچنگ۔۔۔'' ایک اداس سی فاختہ اُڑی۔

''تمھارے جیسی Care کرنے والی کوئی ملی ہی نہیں۔۔۔'' مَیں نے خود کو روکنا چاہا مگر کہہ دیا۔

''میری چھوٹی چھوٹی سی ضروریات اور خواہشات تمھارے لیے زندگی موت کا مسئلہ بن جایا کرتی تھیں، یاد ہے۔ ڈاکٹر برلاس کی فیئرویل پارٹی پر کیا ہوا تھا۔۔۔''

مَیں نے جھلساتی دُھوپ میں یادوں کے بادل کا سہارا لینا چاہا۔۔۔

''ہاں یاد ہے۔۔۔'' شاید کسی بچھڑے ساون کا عکس اس کی آنکھوں میں ابھی محفوظ تھا۔

''تم نے میری میچنگ ٹائی جانے کس طرح اور کہاں سے اَرینج کی تھی۔۔۔'' گزرے لمحوں کے کوڑیالے سانپ یادوں کی پٹاری سے نکل کر لہراتے ہوئے میرے اردگرد رقص کر رہے تھے۔ آج سپیرن بھی ہمراہ تھی، بین بجا رہی تھی مگر جوگیوں کا جوڑا ٹوٹ چکا تھا۔۔۔

مَیں نے جوس کا سپ لیتے ہوئے اس کے چہرے کو ٹٹولا۔

''تو پھر یہ سب کیسے ہو گیا۔۔۔''

''ہم بہت ہی معمولی سی چیزوں پر قادر ہوتے ہیں۔ اُنھیں جان کا روگ بنائے پھرتے ہیں۔ ہلکان ہوئے جاتے ہیں۔ یہ مل گیا تو خوشیاں مل جائیں گی۔۔۔ وہ کھو گیا تو غم مقدر ہو جائیں گے۔۔۔ جب کہ خوشیوں اور غموں کا تعلق تو کچھ ایسے فیصلوں سے ہوتا ہے، جو ہمارے ہاتھ میں نہیں ہوتے۔۔۔'' اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا تاثر تھا جسے مَیں کوئی نام نہ دے سکا۔

''چھوڑو بھی کیا فضول ٹاپک لے بیٹھے ہم لوگ۔۔۔ فیملی کہاں ہے تمھاری۔۔۔''؟

اس نے لہجے کو خوشگوار بناتے ہوئے پُوچھا۔۔۔

''کہاں تمھارے جیسی کوئی ملی ہی نہیں۔۔۔''

''کیا واقعی۔۔۔'' اس کے لہجے میں دُکھ تھا۔۔۔

''ملتا تو کسی کو بھی شاید سب کچھ اپنی مرضی کا نہیں۔۔۔ لیکن کچھ سمجھوتے بہت ضروری ہوتے ہیں'' ۔۔۔ وہ چپ ہو گئی۔۔۔ ہم دونوں کے بیچ کچھ ایسے لمحے آن کر بیٹھ گئے کہ سانس بوجھل ہونے لگی۔۔۔ مَیں نے گھبرا کر ایک قہقہہ لگا دیا۔۔۔ اپنے پھیپھڑوں کو آکسیجن دینے کی ناکام کوشش میں۔

''محبت نہیں کرتا یا Substandered ہے۔۔۔''؟ مَیں نے پوچھا

مذاق کی گرد اُڑاتے ہوئے۔۔۔

''دونوں ہی سمجھ لو۔۔۔'' وہ بولی۔

کتنی عجیب بات ہے کہ اس کے دُکھ کے احساس نے میرے اندر کسی تاسف کو جنم دینے کی

ایک کہانی۔۔۔ بڑی پرانی

مہرو نے سوئے ہوئے رفیق کے اوپر سے لحاف کھینچا

''اٹھ جا کام پر نہیں جانا آج؟ دیکھ تو دن کتنا چڑھ آیا ہے''

رفیق نے کسمسا کر میلا سا لحاف اپنے اوپر کھینچ لیا اور کیچوئے کی طرح مزید سکڑ گیا کہ اس کے بڑھتے ہوئے جسم کے لیے کئی سال پرانا پھٹا ہوا لحاف اب چھوٹا پڑ گیا تھا۔۔۔ سر ڈھانپتا تو پاؤں ننگے ہوتے پاؤں ڈھانپتا تو سر ٹھٹھرتا۔۔۔ سوتے میں جو ذرا پھیل جاتا تو ٹھنڈ کے مارے پھر گول مٹول سا سکڑ جاتا۔۔۔ ایسے میں جو مہرو کی کبھی آنکھ کھل جاتی تو وہ بھی رفیق کی لحاف میں سرک آتی۔۔۔ مہرو کے نرم گرم وجود کا احساس ہوتے ہی رفیق اس کے ساتھ چمٹ جاتا۔۔۔ اور ایک ٹانگ اس کے پیٹ پر رکھ دیتا۔۔۔ بالکل ویسے ہی جیسے ابھی وہ چند دن کا ہی تھا اور اس نے مہرو کے پیٹ پر اپنی ٹانگ لگانے کی کوشش کی تھی اور جب ننھا سا پاؤں نیچے گر گیا تھا تو مہرو نے بے اختیار اسے چوم لیا تھا۔۔۔

آج بھی اس کا جی چاہا کہ رفیق کے ساتھ لپٹ کر لیٹ جائے۔ دیر تک لیٹی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرے۔۔۔ اس کے پاؤں کو ٹانگوں کو اپنے ہاتھوں سے دبائے۔۔۔ وقت کے ہاتھوں جو تھکن اس کے بدن اور رُوح میں در آتی ہے۔۔۔ وہ ساری اپنی پوروں سے چن لے۔

اس کے ایک ایک نقش کو سو سو بار چومے۔۔۔ اس کے کمزور سے جسم کو مامتا کی حرارتوں سے بھر دے۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس کی نظر دوسری جانب دو لاغر سے جسموں پر پڑی۔ جنھیں بخار کی شدّت میں دوائیاں تو دور کی بات ہے ڈھنگ کا کھانا نصیب نہ تھا۔ مہرو پتھر کی ہو گئی۔۔۔ اس نے زور سے لحاف اٹھا کر پرے پھینکا۔

''اٹھ بھی اب۔۔۔ نیند آ رہی ہے تجھے بہت۔۔۔ سوتا رہے گا تو رات کو کھائیں گے کہاں سے۔۔۔؟

رفیق مہرو کے لہجے سے سمجھ گیا کہ اب اٹھتے ہی بنے گی۔۔۔ اس نے گدلے پانی کے چند چھینٹے منہ پر مارے اور رات کا باسی کھانا زہر مار کرنے لگا۔۔۔

کام پر جانے لگا تو خیر دین کی آواز آئی

''رفیق آج اپنی تنخواہ ضرور لے آنا پتر۔۔۔''

''ہاں یاد سے''۔۔۔ مہرو نے بھی کوٹھڑی سے پکارا۔۔۔ ''کام لیتے وقت تو تھکتا نہیں ہوٹل والا اور تنخواہ دیتے وقت ہاتھ ٹوٹتے ہیں من جوگے کے۔۔۔ دس دن اوپر ہو گئے ہیں مجال ہے جو تنخواہ کے پیشے کھیسے سے نکالتا ہو کم بخت ذلیل۔۔۔''

مہرو کی زبان اب چل پڑی تھی۔۔۔ رفیق جانتا تھا کہ اب یہ گاڑی صرف خیر دین کے اسٹیشن پر ہی رکے گی۔ سو وہ کھسک لیا۔۔۔ خیر دین بے چارہ تو مجبور تھا۔ جب سے فیکٹری کی مشین میں آ کر اس کی ٹانگیں کٹی تھیں۔۔۔ وہ تو ایک مٹی کا ڈھیر ہو کر رہ گیا تھا۔۔۔ جس کی دکان اور دو آنکھیں تھیں اور بس۔۔۔ وہ تو مہرو کا مہر تھا کہ دو وقت کی روٹی گالیوں کی چٹنی کے ساتھ اسے دے دیتی تھی۔۔۔ ہاں جب کبھی کچھ اچھے دنوں کی یاد آتی تو خیر دین کے پاس بیٹھ کر اسے تکتی رہتی۔۔۔ چپ چاپ۔۔۔ نہ کچھ بولتی نہ روتی۔۔۔ بس اسے دیکھے جاتی اور پھر اچانک ہی اٹھ کر چل پڑتی کسی بچے کو پیٹنے یا گلی میں کسی سے لڑنے کو۔۔۔ ملک صاحب کے گھر سارا دن کی کھپائی کے بعد لوٹتی تو کبھی کبھار اترن اور کچھ ہانڈیوں کی کھرچن بھی ساتھ ہوتی۔ مہینے کے آخر میں ملنے والی تنخواہ سے چاہے چند روپے ہی کیوں نہ ہوں۔۔۔ وہ ضرور بچا رکھتی۔۔۔ جانے کس آس پر؟۔۔۔ دو

سال پہلے رفیق بڑے شوق سے دُھلے ہوئے کپڑے پہنے۔۔۔بستہ بغل میں دبائے جب سرکاری سکول جایا کرتا تھا تو مہرو جانے کیسے کیسے خواب بُنا کرتی تھی۔۔۔رفیق کی افسری کے۔۔۔سونے کے چھلے کے ایک ریشمی لحاف کے خیر دین کے لیے نئے نکور گرم سوٹ کے۔۔۔اور پپو گڈو کے لیے پوں پوں کرتے کھلونوں کے۔۔۔خیر دین ساری زندگی الجھے اُون کو سلجھے دھاگے کی صورت ڈھالتا رہا مگر مہرو کے خوابوں کے تانے بانے اس کی دھاگہ بنانے والی مشین میں کچھ ایسے الجھے کہ پھر سلجھ نہ سکے۔۔۔گنجل پڑ گئے اور بالآخر ٹوٹ گئے۔بس یہی ایک گلہ تھا مہرو کو اس سے۔۔مگر وہ گلہ نہ کر پاتی تھی۔بس گالیاں دیتی تھی یا بٹر بٹر اسے تکتی رہتی تھی۔۔۔

زندگی کی تمام سچائیوں سے۔۔۔تمام خوبصورتیوں حتیٰ کہ خدا سے اس کا ایمان اس دن چند لمحوں کے لیے اٹھ گیا تھا۔جس دن رفیق کا نام سکول سے کٹا تھا۔۔۔مہرو نے غور سے دیکھا تھا کہ رفیق کے ۔میلے کچیلے یونیفارم میں ان کا بھرم تو کیا اس کا سوکھا تن ڈھانپنے کا بھی اب حوصلہ نہ رہا تھا۔سو اس نے بچے کچھے تار تار خواب، پھٹی ہوئی اوڑھنی کے ایک کونے سے باندھ لیے اور رفیق کو ورکشاپ والے چائے کے ہوٹل پر ملک جی کی سفارش سے رکھوا دیا۔۔۔کہ حقیقت اب محض جسم اور رُوح کے درمیان قائم ایک رشتے کو برقرار رکھنے کا نام تھا۔۔۔اور یہ رشتہ برقرار رکھنے کے لیے دو وقت کی روٹی چاہیے تھی۔۔۔

منہ اندھیرے رفیق کو جگانے لگتی تو ''رفیق اٹھ پتر سکول جانا ہے'' اس کے منہ سے اچانک نکل جاتا۔۔۔'' کیا ماں؟ رفیق حیرت سے پوچھتا۔۔۔مہرو لب بھینچ لیتی۔۔۔اپنے آنسو چھپانے کو کبھی وہ مٹی کے تیل کو گالی دیتی اور کبھی آنکھ میں پڑنے والے فرضی لکھ کے رشتے جانے کن سے جوڑنے لگتی۔۔۔

رفیق دھیرے دھیرے ماں کا دکھ جان گیا تھا۔۔۔اب تو ماں کا محض ''رفیق پتر'' ہی کہنا کافی ہوتا۔۔۔وہ اسے اگلے جملے کی اذیت سے بچانے کے لیے فوراً ہی آنکھیں کھول دیتا۔۔۔نیند سے بوجھل آنکھوں کو زبردستی کھولنے کی کوشش کرتا ہوا رفیق کا چہرہ دن بھر مہرو کو رُلاتا رہتا۔۔۔مگر کب تک۔۔۔''رفیق پتر اٹھ کام پر نہیں جانا'' اب وہ بڑی سہولت کے ساتھ کہہ لیتی تھی۔رفیق بھی اب

آنکھوں پر ہاتھ رکھے رکھے کئی مرتبہ اٹھنے سے انکاری ہو جاتا جس پر کبھی کبھار مہرو ایک آدھ ہاتھ رسید کر دیتی۔۔۔وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھتا اور بادل نخواستہ کام پر چلا جاتا۔

ہاں جس دن وہ احتجاجاً ناشتہ نہ کرتا۔۔۔مہرو بھی سارا دن نہ کچھ کھاتی نہ پیتی۔۔۔بس بڑبڑاتی رہتی۔۔۔خیر دین اس کی بے چینی پر کڑھتا۔۔۔مگر اس ڈر سے نہ بولتا کہ کچھ کہہ بیٹھا تو شامت آ جائے گی۔۔۔سو مہرو کو اپنے حال پر چھوڑ دیتا۔۔۔وہ رفیق کے آنے تک بار بار گلی میں جھانکتی۔۔۔اس شام وہ گھر میں بھٹا ضرور بناتی کسی پڑوسن کی کڑوی کسیلی سن کر بھی۔۔۔کہ اکثر میٹھا ادھار لے کر ہی بن پاتا تھا۔۔۔رفیق ناراض ناراض اس شام کو گھر آتا تو اسے سینے سے لگا کر یوں چومتی جیسے برسوں بعد دیکھا ہو۔۔۔ایک ایک نوالا یوں کھلاتی جیسے وہ دو سال کا بچہ ہو۔۔۔رات دیر تک وہ رفیق سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی۔۔۔ہوٹل کے بارے میں۔۔۔ملک کے گھر کے چھوٹے چھوٹے قصے۔۔۔اپنے بچپن کی کہانیاں اور نہ جانے کیا کیا؟۔۔۔اس رات اس کے سارے بچھڑے خواب جانے کہاں کہاں سے اس کے گلے آن ملتے۔۔۔کچھ دیر کو ہی سہی۔۔۔اس رات وہ پپو اور گڈو کو خیر دین کے ساتھ سلا دیتی اور خود رفیق کے ساتھ سو جاتی۔۔۔یوں جیسے آج ہی اسے جنم دیا ہو۔۔۔

لیکن اب تو روٹھنے والے دنوں اور منانے والی راتوں کی گنجائش ہی زندگی میں بہت کم رہ گئی تھی۔۔۔جس دن رفیق چھٹی کرتا ہوٹل سے۔۔۔مہرو بھی کسی نہ کسی بہانے ملک جی کے گھر سے جلدی آ جاتی۔۔۔خانساماں سے چکنی چپڑی باتوں کے بدلے کسی کھانے کی اچھی سی چیز سمیت۔۔۔خیر دین مہرو کی اس معصوم سی ممتا بھری بے ایمانی پر دل کھول کر ہنستا۔۔۔وہ سمجھتا تھا کہ رفیق مہرو کا بیٹا ہی نہیں۔۔۔اچھے دنوں کا وہ سپنا بھی ہے جس سے مہرو کا اندر کبھی بھی دست بردار ہونے کو تیار نہ تھا اور نہ ہو گا۔۔۔ بظاہر دُنیا کے ہنگاموں سے لاتعلق وہ اپنی زندگی کے بکھیڑوں میں الجھے نظر آتے تھے پر وہ بھی جانتے تھے کہ شہر کی فضا میں کئی سالوں سے نفرت کا زہر گھل رہا ہے۔۔۔لیکن شاید وہ اس بات سے واقف نہ تھے کہ فرعونوں کی فرعونیت کو قائم رکھنے کے لیے اہراموں کی بنیادوں میں انسانی خون ڈالنے کی روایت آج بھی زندہ ہے۔۔۔خیر و شر کا کھیل

آج بھی جاری ہے اگرچہ اس کھیل کے اسلوب بدل گئے تھے۔۔۔نام بدل گئے تھے۔۔۔کردار بدل گئے تھے۔۔۔نہیں بدلا تھا تو وہی ایک بنیادی اصول۔۔۔انسانی قربانی کا اصول۔۔۔چاہے یہ قربانی ارمانوں کی ہو یا جان کی۔۔۔سر شام ہی خوف اور نفرت کا آتش فشاں لاوا اُگلنے لگتا۔۔۔سڑکوں، بازاروں، گھروں اور دلوں پر یہ لاوا آگ بن کر برستا۔۔۔کہیں راکھ بن کر چمٹ جاتا۔۔۔دھیرے دھیرے ہر شے راکھ جیسی ہوتی گئی۔۔۔سیاہ ٹیالی۔۔۔دلوں پر نگاہوں پر راکھ کے ڈھیر جمتے گئے۔۔۔جذبوں کی کرنیں دُھندلا گئیں۔۔۔پتھرا گئیں۔۔۔خیر دین اور مہرو کی بستی کے مقدر میں بھی کبھی کبھی فائرنگ یا ایک آدھ قتل لکھ دیا گیا تھا۔۔۔

رفیق جب بھی کوئی ایسا واقعہ سنتا تو مہرو سے اکثر پوچھتا ''اماں یہ لوگ ایک دوسرے کو قتل کیوں کرتے ہیں بھلا؟''

''پتر رفیق ایسے لوگوں کو شیطان گم راہ کرتا ہے۔۔۔'' خیر دین جواب دیتا ''مگر ابا ماسٹر جی تو کہا کرتے تھے کہ خدا نے انسان کو عقل دی ہے۔۔۔سب چیزوں سے زیادہ سیانا بنایا ہے تو پھر۔۔۔انسان شیطان کی بات کیوں مانتا ہے۔۔۔'' خیر دین جواب نہ دے پاتا تو رفیق کا ذہن الجھ جاتا۔۔۔وہ معصوم شاید اس نکتے کو سمجھ نہ پایا تھا کہ سب سے بڑا شیطان تو خود انسان کے ہی اندر چھپا بیٹھا ہے۔

مہرو ہنستی ''چل زیادہ باتیں نہ بنا۔۔۔بڑا سیانا ہو گیا ہے نا'' اس کی ہنسی میں غرور اور محرومی گڈمڈ سے ہو جاتے اور حلق میں اچانک جیسے پھندہ سا لگ جاتا۔۔۔رفیق یونیفارم میں ہنستا مسکراتا سکول جاتا اس کی نگاہوں کے سامنے آ جاتا۔۔۔ایک ایسا سپنا جو خیر دین کی ٹانگوں کے ساتھ ہی چکنا چور ہو گیا تھا۔۔۔

''پتر رفیق خیال کیا کرنا۔ہوٹل پر ہر قسم کا بندہ آتا جاتا ہے۔زمانہ بڑا خراب ہے پتر۔۔۔تو بس اپنے کام سے کام رکھا کر۔۔۔کبھی جھگڑے فساد کی بات ہو تو سیدھا گھر آ جانا۔۔۔''

جانے خیر دین کو اچانک کیا خیال آیا۔۔۔

''اچھا ابا۔۔۔''

رفیق نے سعادت مندی سے سر ہلا دیا۔۔۔''پر ابا ہوٹل پر لوگ دہشت گردوں کی بڑی باتیں کرتے ہیں۔یہ دہشت گرد ہوتے کون ہیں۔۔۔''

''اچھا بس بھی کر۔۔۔ہر وقت دہشت گرد کون ہوتے ہیں پوچھتا رہتا ہے۔۔۔'' مہرو جانے کیوں بگڑ جاتی۔۔۔اور رفیق کی سانس کی تکلیف بھی ٹھنڈ کی وجہ سے بڑھ گئی تھی۔۔۔اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ چند دن چھٹی کر لے اور گھر پر بہن بھائی کے ساتھ کھیلے۔۔۔گلی میں گلی ڈنڈے کے میچ ڈالے لیکن وہ صرف سوچ کر ہی رہ جاتا تھا۔۔۔چھٹی کی صورت میں دیہاڑی کے بجائے مار کا بونس ملتا تھا۔۔۔رفیق نے مہرو سے یہ بات ہمیشہ چھپائی تھی۔۔۔وہ جانتا تھا کہ ماں کو بتا دیا تو ہوٹل سے پہلے ہی اس خستہ ناؤ کا نا خدا بنا دیا تھا۔اس دن ٹھنڈ بڑی شدید تھی۔اس کا شدت سے جی چاہ رہا تھا کہ بس لحاف میں پڑا رہے۔گڈو اور پپو کی بیماری کے باعث مہرو بھی چڑچڑی ہو رہی تھی اس نے ڈانٹ کر رفیق کو زبردستی اٹھایا اور کام پر بھیج دیا لیکن خود سسکتی رہی۔۔۔

''آخر کو تو وہ بھی بچہ ہی ہے نا''۔۔۔اس کے دل پر آنسو قطرہ قطرہ گرتے رہے۔آج کل سانس کتنی مشکل سے لیتا ہے۔یہ بیماری بھی نگوڑی اسے ہی لگنی تھی۔

''کیا ہو جاتا اگر وہ آج نہ جاتا۔۔۔یہ دونوں مر نہ جاتے''۔۔۔وہ سارا دن اپنے آپ سے لڑتی رہی۔۔۔پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ پوری گلی میں پھری اور کسی نے ادھار بھی نہ دیا کہ میٹھا پکا کر شام کو رفیق کو خوش کر دیتی۔۔۔

شام نے رات کا چولا پہن لیا مگر رفیق نہ پہنچا۔۔۔مہرو بار بار دروازے کی جانب دیکھتی آخر اس سے رہا نہ گیا۔۔۔''خیر دین تم بچوں کو دیکھنا میں ذرا ہوٹل تک ہو آؤں۔۔۔''

''اللہ خیر کرے گا۔۔۔'' خیر دین بولا۔۔۔۔مہرو بھاگم بھاگ وہاں پہنچی تو ایک قیامت اس کی منتظر تھی۔

ہوٹل کے مالک کے ساتھ چند لڑکوں کو بھی پولیس پکڑ کر لے گئی تھی۔۔۔کس جرم میں؟ کوئی نہ جانتا تھا۔

مہرو کو لگا سارا شہر سنسان ہو گیا ہو۔۔۔وہ لڑکھڑا کر بیٹھ گئی۔۔۔جانے کس نے سہارا دے

کر اسے ملک جی کے گھر تک پہنچایا۔

ملک جی تک خبر شاید پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔۔۔ اُنھوں نے مہرو کو ڈھیروں تسلیاں دے ڈالیں۔۔۔ وہ ان کے چہرے کو یوں دیکھے جا رہی تھی جیسے تقدیر کا فیصلہ ان کے چہرے پر ہی لکھا جانا ہے۔۔۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اور مہرو کا دل جیسے کوئی مٹھی میں لے کر مسل رہا تھا۔

"آپ کو اپنے بچوں کا واسطہ۔۔۔ مجھے میرے رفیق سے ملوا تو دیں اس کا کیا گناہ ہے؟ وہ تو بیمار تھا۔۔۔ کسی کو تھپڑ بھی نہیں مار سکتا، اسے پولیس کیوں لے گئی۔۔۔؟ مہرو ملک جی کے پیروں میں گر گئی۔۔۔ "حوصلہ کر مہرو۔۔۔ حوصلہ۔ تیرا کیا خیال ہے جنھیں پولیس پکڑتی ہے وہ سب گناہگار ہوتے ہیں"۔۔۔ ملک جی کے لہجے میں بڑا دکھ تھا۔۔۔ مہرو روتے روتے زمین پر ڈھیر سی ہو گئی۔ "سارا قصور میرا ہے جی۔۔۔ مَیں نے بھیجا تھا آج اسے۔۔۔" وہ سسکتی رہی تڑپتی رہی۔۔۔ اس کی زبان خشک ہو رہی تھی۔۔۔ حلق سوکھ رہا تھا جانے دن گزرے یا گھنٹے۔۔۔ کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔۔۔ ملک جی نے فون اٹھایا۔۔۔ "مَیں پہنچ رہا ہوں ابھی۔۔۔"

مہرو تڑپ کر اٹھی۔۔۔ "آپ وہیں جا رہے ہیں نا۔۔۔ تھانے۔۔۔ مَیں بھی چلوں گی آپ کے ساتھ۔۔۔"

"نہیں ابھی نہیں۔۔۔" ملک جی کے لہجے میں جانے کیا تھا وہ سن کر سو گئی پتھر کی ہو گئی۔۔۔ اور پھر مہرو کو ایسا لگا جیسے زمانے گزر گئے ہیں اور وہ رفیق کے انتظار میں بیٹھی ہے۔۔۔ جانے کتنی صدیوں سے۔۔۔ اس کے پاؤں زمین نے پکڑ رکھے ہیں۔۔۔ اور اس پر ریت گر رہی ہے۔۔۔ گرم تپتی ہوئی ریت۔۔۔

پھر اچانک ہی جیسے پتھر میں جان پڑ گئی۔۔۔ مہرو نے اپنی آواز عرش تک جاتی سنی۔۔۔ ملک جی کے ساتھ اس کا لاڈلا اس کا رفیق آ رہا تھا۔۔۔ لیکن یہ کیا؟ رفیق تو دو پاؤں پر چل کر گیا تھا۔۔۔ یہ چارپائی پر کیوں لیٹا آ رہا ہے۔۔۔ اس کے کپڑے میلے ضرور تھے۔۔۔ مگر اتنے بڑے بڑے سرخ اور سیال دھبے تو کبھی بھی نہ پڑے تھے، اس کے کپڑوں پر۔۔۔

کیا ملک جی۔۔۔ میرا رفیق تو میری مار سے بچنے کے لیے بھی تیز نہیں بھاگ سکتا۔۔۔

اسے روکنے کے لیے؟۔۔۔ اٹھ رفیق پتر اٹھ میرے۔۔۔ تو پوچھتا تھا نا۔۔۔ وحشت گرد کون ہوتے ہیں۔۔۔ ہر وقت پوچھتا تھا تو ہر وقت۔۔۔ وہ ہنستی چلی گئی۔

"بڑی خوش ہے اماں۔۔۔ خواب میں کوئی خزانہ مل گیا ہے کیا"۔۔۔ رفیق اس کے پاس بیٹھا پوچھ رہا تھا۔۔۔

آہاں۔۔۔ آ گیا تو پتر۔۔۔ رفیق آ گیا۔۔۔ تو ٹھیک ہے نا۔۔۔ تو ٹھیک تو ہے نا" وہ شادی مرگ کی سی کیفیت میں چونک کر اٹھ بیٹھی۔۔۔

اس نے رفیق کو سینے سے چمٹا لیا۔ اس کے آنسو دھیرے دھیرے رفیق کے بالوں میں جذب ہوتے رہے۔ مہرو کے ہاتھ اس کے جسم پر پھاہے بن کر رک گئے۔

"تو اب ہوٹل میں نہیں جائے گا رفیق۔۔۔ کبھی نہیں جائے گا جب تک مَیں زندہ ہوں۔۔۔ وہ بڑبڑائی۔۔۔

رفیق کچھ بھی نہ سمجھا مگر مہرو کا فیصلہ سنتے ہی اس کے بچپن کے روٹھے ہوئے سارے کبوتر اس کی آنکھوں کی چھجی پر آن بیٹھے۔

☆☆☆

بولتے لمحے

دوسری جانب سے لائن جانے کب سے کٹ چکی ہے۔ ریسیور کے اندر سے اُبھرنے والی مخصوص ٹون کافی دیر سے اس بات کا اعلان کیے جا رہی ہے۔ مگر دوسری جانب وہ ایک موہوم سی اُمید پر فون ہاتھ میں تھامے بیٹھی ہے۔ وہ جانتی ہے جب دلوں پر مہریں لگ جائیں تو محبتوں، آنسوؤں اور جذبوں کی کوئی بھی چابی زنگ آلود قفل کو کھول نہیں سکتی۔ مگر شاید۔۔۔ شاید کبھی۔۔۔ سارا جھگڑا اسی مگر شاید اور شاید کبھی کا ہی تو ہے انسان معلق رہتا ہے نہ ڈوب سکتا ہے اور نہ ہی تیر سکتا ہے۔ بحرِ مردار کے تعفن زدہ کالے پانی میں گھر جانے والے بے بس ذی رُوح کی طرح۔۔۔ جذبے اور محبتیں جب کھوٹی ہونے لگتی ہیں تو ان کے اندر کا زنگ باہر نکل نکل کر جمنے لگتا ہے۔ تہ در تہ پیلے زرد یا پھر سرخ اور پھر سیاہی مائل۔۔۔ یہ زنگ تازہ ہوا اور روشنی کی کرنوں کو دلوں تک پہنچنے نہیں دیتا اور وہ جسم بحیر مردار بن جاتے ہیں۔

ایسا ہی ایک جسم فون کی دوسری جانب موجود تھا جس کے کالے پانی میں گھر کر اس کی صدائیں دم توڑ رہی تھیں۔ گھٹن اس کے رواں رواں میں در آئی تھی۔ ہر شے دُھندلی سی نظر آنے لگی تھی۔ وہی جسم وہی شخص جو کبھی نگاہوں سے اس کے دل کی بات جان لیتا تھا، آج سب کچھ جان کر بھی انجان ہے کیا اس کا جرم اتنا سنگین تھا۔؟ وہ جو ساری عمر دوسروں کو معاف کرتی رہی بڑی

بڑی خطائیں۔۔۔ بڑی بڑی لغزشیں بھلاتی رہی آج اس کی ایک چھوٹی سی خطا۔۔۔ سچ بولنا، اپنے بھرم اپنے مان کے ٹوٹنے پر احتجاج کرنا بھی کوئی معاف نہیں کر سکتا۔ شاید اس لیے کہ اس سے کسی کو سزا کا خوف نہیں۔۔۔ یہی تو کائنات کا اصول ہے معاف کر دینے والوں کا خوف دلوں سے اتر جاتا ہے۔ سزائیں دینے والوں سے لوگ ڈرتے رہتے ہیں۔۔۔ چاہے وہ سزا دینے کی قوت سے محروم بھی ہو جائیں تب بھی!

اس مٹی کی خاصیت ہی شاید یہی ہے کیوں کر صدیوں سے غلام ابنِ غلام ابنِ غلام رہنے کے بعد سب عیسیٰ کی بھیڑیں بن گئے ہیں۔ محض ناک کی سیدھ میں چلنے والے اور اس کی ذات تو ہمیشہ سے ہی Taken for granted قسم کی رہی۔ بولتی بھی رہی لڑتی بھی رہی احتجاج کرتی رہی، لیکن محض زبانی زبانی۔ نہ کسی کو مارا نہ اجاڑا نہ کسی کا حق چھینا۔ وہ تو اپنے حقوق نہ لے سکی تو پھر اسے معافی کیوں کر مل جاتی ایک بے ضرر وجود کی بھلا شطرنج کی بساط پر کیا حیثیت؟ جو کسی کو مات نہ دے سکے، وہ نہ شاہ کے کام کا نہ وزیر کے کام کا! سو وہ کٹتی گئی غیر محسوس طریقے سے ان سب خود غرض لوگوں سے جو ایک دوسرے کو نوچنے کھسوٹنے میں لگے تھے۔ چہروں پر ملمع چڑھائے دلوں میں نفرتوں اور کدورتوں کی آگ جلائے جب وہ سب مل کر بیٹھے ہنستے بولتے تو اس کا جی شدت سے چاہتا کہ وہ ان سب کے چہروں سے نقاب نوچ پھینکے۔ جب یہ خواہش شدید تر ہونے لگتی تو وہاں سب سے دور ہو جاتی کسی لغزش کے خوف سے!۔۔۔

لیکن کچھ رشتے کچھ لوگ پاؤں پکڑ بھی لیتے ہیں۔ لاکھ چاہو مگر دامن چھڑانا آسان نہیں ہوتا ایسے عمل میں کئی بار پل صراط سے گزرنا پڑتا ہے۔ ننگے پاؤں دو دھاری تلوار پر چلنا پڑتا ہے۔۔۔ مگر فاصلہ ہے کہ گھٹتا نہیں جوں کا توں رہتا ہے۔۔۔ تلوے لہولہان ہو جاتے ہیں۔ آنسو خشک ہو جاتے ہیں۔ نہ ختم ہونے والے دائرے میں بھاگتے بھاگتے سانس پھول جاتی ہے مگر نیوکلیس اور پورٹون کا درمیانی فاصلہ ہمیشہ وہی رہتا ہے۔ قربت میں فاصلے۔۔۔ فاصلوں میں قربت۔۔۔ اس نڈھال کر دینے والی کیفیت اور اذیت سے تو بہتر ہے کہ کوئی دھماکہ ہو اور Proton کہیں دور فضا میں تیرتا ہوا گم ہو جائے ہمیشہ کے لیے کبھی نہ واپس آنے کے، لیکن کیا یہ ممکن ہے کیا یہ اتنا

آسان ہے جتنا سمجھا جاتا ہے؟

اس بے یقینی کے عمل کو ختم کرنے کے لیے آج اس نے پھر اپنی انا کا سر کچلا اور نمبر ڈائل کر دیا۔ دوسری جانب سے وہی مخصوص آواز سنائی دی جسے سن کر ہمیشہ اس کے دل میں جھرنا سا پھوٹ پڑتا ایک جذبہ کروٹیں لینے لگتا۔ ''ہیلو'' وہ دھیمے سے بولی۔ چند لمحوں کا سناٹا اس کے اردگرد پھیل گیا۔ اس کی رُوح میں اتر گیا۔ کلک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ، دوسری جانب سے ریسیور رکھ دیا گیا۔ سناٹے میں بس وہی کلک اور ٹن ٹن کی آواز رہ گئی جو دھیرے دھیرے اونچی ہوتی گئی۔ اتنی اونچی کہ اس کے کان پھٹنے لگے۔ چاروں طرف فضا میں اس کے وجود کے اندر باہر، کلک کلک، تالیاں بجانے لگی۔ اس کا وجود روئی کی مانند دھنکا جانے لگا۔ کثافت سے اس کا دم گھٹنے لگا۔ سانس رکھنے لگی، شور بڑھتا گیا، وہ چیخنے لگی۔ چیختے چیختے اس کے حلق سے عجیب وغریب آوازیں برآمد ہونے لگیں وہ فرش پر ڈھیر ہوتی چلی گئی۔

سٹڈی روم میں بیٹھا اس کا شوہر بھاگا آیا۔ وہ فرش پر یوں پیٹ پکڑے دوہری پڑی تھی جیسے دردِزہ سے تڑپ رہی ہو۔ ''نینا! کیا ہوا نینا! احسان نے پریشان ہو کر پکارا تو نینا سسکتی ہوئی یوں اس کے گلے لگ گئی جیسے اسے اس کے کھو جانے کا ڈر ہو۔ جیسے وہی اک آخری سہارا ہو۔ احسان کو بلکتی تڑپتی نینا اس لمحے میلے میں کھوئی ایسی بچی لگی جس کا سب کچھ کھو گیا ہو۔ کھلونوں، کھیل اور گھر کسی چیز کا نشان نہ مل رہا ہو اسے!

''ایزی نینا ایزی'' احسان نے اسے محبت سے تھپکا اور سہارا دے کر بیڈ پر لٹا دیا۔ وہ یوں احسان سے مسلسل چمٹی رہی جیسے اسے خوف ہو چھین جانے کا! کانچ کے سبھی بت ایک ایک کر کے ٹوٹتے گئے۔۔۔ چھوٹی چھوٹی خراشوں نے اسے زخمی ضرور کیا، مگر وہ سالم رہی۔ مگر آج جو بت ٹوٹا وہ خود بھی بکھر گئی۔ کرچیاں اسے چبھ گئیں۔ لہو آنکھوں سے بہہ نکلا۔ جانے کتنی دیر وہ احسان کے سینے سے لگی روتی رہی۔۔۔ اس کے محبت بھرے لمس نے اسے دھیرے دھیرے پُرسکون کر دیا۔ سوتے میں بھی وہ کسی معصوم بچی کی مانند سسکتی رہی۔ شاید کوئی ڈراؤنا سپنا دیکھتی رہی۔ کسی بچے کا سب سے بڑا دکھ اس کا پسندیدہ کھلونا چھن جانا ہوتا ہے نا شائد! کتنا بڑا المیہ تھا اس کی ذات کا۔ کہ

وہ رشتوں کے ہجوم میں تنہا تھی۔ اس کا ماں جایا جو اس کا سب کچھ تھا۔ دوست بھائی بہن سب کچھ۔ جس کی محبتوں پر اسے بڑا مان تھا۔ غلط فہمیوں کی آنچ سے ایسا پگھلا موم بن کے بہہ گیا۔ کوئی سچ کوئی گلہ وہ اس کے منہ سے نہ سن سکا کہ وہ عادی نہ تھا۔ گلہ سننے کا اسے تو گلہ کرنے کا حق دیا گیا تھا۔ ساری زندگی۔۔۔ اسے خدا بنا دیا گیا تھا۔ اتنی اونچی مسند پر بیٹھا دیا گیا تھا کہ باقی سبھی اسے بونے نظر آنے لگے تھے۔ اس خدا کی خدائی کو ضرب لگائی چند مفاد پرستوں نے اور لات ومنات اپنے ہی قدموں میں ڈھیر ہو گئے اس کے دل کی دیواروں پر شک وشبے کی مکڑیوں نے جال بننا شروع کر دیے اور سیاہی کی تہیں دبیز ہوتی گئیں۔

حیران نینا یہ سب کچھ دیکھتی رہی اور آخر چپکے سے اپنے حصے کی تمام محبتوں سے دست بردار ہو گئی کہ اس کے بس میں یہی کچھ تھا۔ بابل کا آنگن بھی پرایا سا ہو گیا تھا اس کا چند گھڑی قیام بھی کسی کو گراں گزرتا۔ وہ کسی سے کیا کہتی کہ کچھ چیزیں بغیر کچھ کہے ہی غیر محسوس طریقے سے سمجھا دی جاتی ہیں۔ جب کہ سمجھنے والے کا Reciever بھی حساس ہو اور وہ اپنی انا کا مارا ہوا بھی ہو۔ پھر تو درمیانی راستے پر چلنے کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے۔

مکڑی کا جال پھیلتا گیا، پھیلتا گیا، حتیٰ کہ بابل کے آنگن میں جا بجا سیاہ دھبے سے اُبھر آئے جو ہر مرتبہ کبھی اس کے بالوں، کبھی چہرے اور دامن سے چپک جاتے۔۔۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کبھی کبھار اس لیے چلی جاتی کہ اپنوں کو ایک نظر دیکھنے دکھ سکھ کہنے کو جی چاہتا مگر بند کواڑوں پر دستک سے کیا فائدہ کہ اس سے محبت کرنے والوں کو جن سے نینا کو بھی پیار تھا۔ وہ اس کے ماں جائے کے پیاروں کو پسند نہ تھے۔۔۔ دھیرے دھیرے دیواریں اونچی ہوتی گئیں۔ اتنی اونچی کہ اس کا دم ان کے درمیان گھٹنے لگا۔ ماں سے لڑتی رہی کہ تو نے میرے حصے کا پیار بھی بھائی کو دیا، مگر اپنی ساری محبتیں خود اس پر نچھاور کرتی رہی۔ تمام عمر ہزار بار اپنے دل کو ایمان داری سے کھنگالنے پر بھی کبھی اس کے لیے نفرت نہ ڈھونڈ پائی۔ جسے وہ سدا سراہتی رہی۔ وہ تو بھربھری مٹی کا ایک بت نکلا۔ جو ایک بےضرر سے رشتے کو Balance نہ کر سکا یا شاید اس کی مصروف زندگی میں محبتوں کے لیے گنجائش ہی اتنی تھی۔ پرانی اور پرائی محبتوں کو کب تک وہ جھاڑ پونچ کر رکھتا، ان سے بھلا کیا

فائدہ تھا۔۔۔ جو چیزیں نئی راہوں میں رکاوٹ محسوس ہونے لگیں عقل مند لوگ ان سے دامن بچا لیتے ہیں، اور وہ ٹھہرا اسد اکا عقل مند۔

پاگل تو ایک وہی تھی جو نئے گھر میں بھی پرانی تصویریں سجائے پھرتی تھی۔ اس کا اپنا آنگن ہرا اُبھرا تھا اور وہ سوکھے گملے اٹھائے سجائے پھرتی تھی کہ شاید کبھی کوئی تازہ کونپل پھوٹ پڑے، رفتہ رفتہ آنسو خشک ہونے لگے۔ بچوں اور گھر کی ذمہ داریوں نے کئی زخم بظاہر بھر دیے، مگر تنہائی میں کہیں کبھی ایک ننھا سا آنسو دل میں چنگاری بن کر گرتا اور وہ دیر تک سلگتی رہتی۔۔۔ جانے میکے کی خوشیاں اور غم دونوں اتنے پیارے کیوں ہوتے ہیں؟ وہ جو بہت منفرد تھی اپنے اس روایتی کردار انی اس روایتی کمزوری پر جھنجھلا بھی جاتی، مگر عورت تو عورت ہی ہے نا۔ جو کبھی نہیں بھولتی کہ میکہ اس کا مان ہے اس کا بھرم ہے۔۔۔ اور جب یہ بھرم یہ من ٹوٹتا ہے تو اس پر کیا گزرتی ہے؟

اب تو اس نے فون کے قریب سے بھی گزرنا چھوڑ دیا دل جو بے اختیار تھا۔ ہر سانس ایک ایک صدی بن کر گزرتی رہی۔ کسی نہ آنے والے کے انتظار نے اس کے قدم بوجھل کر دیے۔۔۔ کسی نہ بجنے والی گھنٹی کی آواز نے اس کی سماعتوں میں شور برپا کیے رکھا، ایک دن اچانک ہی جیسے سناٹا سا چھا گیا۔۔۔ اک سکوت طاری ہو گیا۔ وہ شور کو ترسنے لگی۔ لائن کی دوسری جانب وہ تھا۔ جانے وہ کیا کیا کہتا رہا، اس نے تو محض اتنا ہی سنا ''آؤ گی نا۔۔۔؟'' اس کے اندر کا خلا باہر آ گیا تھا۔ وہ بت نہ جانے کہاں کب اور کس کے ہاتھوں بری طرح ٹوٹ چکا تھا کہ جس کا ٹوٹنا اب بھی ہمیشہ کی طرح نینا سے نہ دیکھا گیا۔ ''آؤں گی ضرور آؤں گی'' اس نے خود کو کہتے سنا۔

وہی انداز وہی بولنے کا دھیما سٹائل سر کے بال سفید ہو چلے تھے، اپنے مخصوص لہجے میں جب اس نے نینا کو خوش آمدید کہہ کر گلے لگایا تو وہ جان گئی برف پگھل چکی ہے، گلیشیر تڑخ چکا ہے۔۔۔ اور اندر ہی کہیں پانی کا دھارا پھوٹ رہا ہے۔ اس نے بے حد احتیاط کے ساتھ قدم بڑھائے۔۔۔ کہیں برف کی شیشے جیسی تہہ کرچی کرچی نہ ہو جائے۔

شادی کے تمام مراحل بخیر و خوبی طے کرنے کے بعد بیٹی کو الوادع کرنے کے بعد نجانے کیوں وہ نینا کے گلے میں بازو حمائل کر کے رو پڑا۔ نینا کو لگا وقت بہت پیچھے لوٹ گیا ہو، آج پھر وہ

دونوں ان کہی کہہ کر رہے تھے اور ان سنی سُن رہے تھے آج اتنے زمانوں بعد وہ بہن کا دکھ جان پایا تھا آج جب اس کی اپنی بیٹھی کے لیے میکہ پرایا ہو گیا تھا تب نا۔۔۔!

☆☆☆

Rugrates

"Dad آپ کی میڈیسن کا وقت ہوگیا ہے۔"---میرا بیٹا زبردستی کی مسکراہٹ لیے مجھے دوائی پینے کو کہہ رہا ہے۔

اسے یہ کام خود ہی کرنا پڑتا ہے کہ مَیں اس کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ سے دوائی لیتا نہیں---کیا پتہ میرا کوئی دشمن مجھے زہر ہی دے دے، اسی بہانے---اس کے سوا اب میرے کمرے میں کوئی اور داخل بھی نہیں ہوتا۔ صرف اس کی آواز سن کر اس کا چہرہ دیکھتے ہی مَیں جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا ہوں۔

میری بہوئیں، پوتے سبھی مجھ سے عاجز آچکے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں کہ مَیں اُنھیں تنگ کرتا ہوں یا بات نہیں مانتا---مَیں تو بہت اچھا Patient ہوں۔ خاموش بیٹھا رہتا ہوں نہ کسی کو تنگ کرتا ہوں نہ توڑ پھوڑ کرتا ہوں اور نہ ہی کسی کی جان لینے پر آمادہ ہوں---تبھی تو مجھے انیکسی کے اس ایک گوشے میں ضرورت کی تمام اشیا سمیت ڈال دیا گیا ہے---ورنہ ہو سکتا تھا کہ مجھے کسی ہسپتال کے کسی وارڈ میں جمع کروا دیا جاتا---حتیٰ کہ میرا نمبر اس دُنیا کے باسیوں کی لسٹ میں سے خارج ہو جاتا۔

مَیں نے بتایا نا کہ مجھے اپنے بیٹے سے بہت پیار ہے اور اس سے دوری کا تصور جان

لیوا---سو چپ چاپ پڑا رہتا ہوں---

یہ چند دن پہلے کا قصہ نہیں---اصل میں ساری گڑبڑ اس دن شروع ہوئی جس دن مجھے نوکری سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ ایک جھوٹے مقدمے میں الجھا کر---اس دن میرے بیٹے کی ماں یعنی میری بیوی زچگی کے مراحل سے گزر رہی تھی---میری کئی سالوں کی محنت اور خدمت کو عین میری خوشی کے لمحوں میں صرف ایک خط کے ذریعے زیرو کر دیا گیا۔

مَیں تو صرف مسجد میں گیا تھا---اس سے ایک سوال کا جواب مانگنے، بس ذرا جذباتی ہو گیا تھا---پولیس نے نقصِ امن کے جرم میں رات بھر حوالات میں بند رکھا۔ صبح ہسپتال پہنچا تو میرے بیٹے کی ماں، جیسے میرے انتظار ہی میں تھی---مجھے میری امانت سونپی اور چلی گئی---مَیں تو اسے روک بھی نہ سکا---کچھ کہہ بھی نہ سکا، اپنی صفائی میں اور وہ چلی گئی۔ بھلا پھر مَیں کیا کرتا---مَیں بھی وہی کرنے لگا جو سبھی عقل مند لوگ کرتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ مَیں پھلتا پھولتا گیا۔ اب میں معزز بھی تھا اور قابلِ احترام بھی۔ اب تو میری جان کی حفاظت کے لیے پولیس میرے ساتھ رہتی تھی۔

مَیں زندہ تھا تو مجھے کسی نے مرنے سے نہ بچایا۔ جب مر گیا تو مردے کی حفاظت ہر کوئی کرنے لگا کہ مردہ قیمتی تھا---مردہ ہر جگہ کیش ہو رہا تھا---کفن بھی سونے کا تھا اور کفن کے اردگرد بیٹھنے والے بھی سونے کے بنتے جا رہے تھے۔

ابھی کل ہی میرا پوتا اپنے باپ سے تشویش بھرے انداز میں اپنے کمپیوٹر کی خرابی کا ذکر رہا تھا کہ اس کے کمپیوٹر میں کوئی Dorment Virus تھا جس نے کئی دوسروں کے بھی کمپیوٹر ایک ہی دن میں ایک خاص وقت پر Corrupt کر دیے تھے۔ پگلا! یہ تو بنیادی اصول ہے Survival کا! بھئی ہر Creator اپنی Creation کو بس ایک خاص مدت تک بناتا ہے۔ تاکہ اسے استعمال کرنے والے یا وہ خود اپنے سسٹم کو سمجھنے نہ لگ جائیں۔ جونہی وہ Point آتا ہے Creation یا تباہ ہو جاتی ہے یا تباہ کر دی جاتی ہے۔ ورنہ تو تجوریاں خالی ہو جائیں۔

ہم انسانوں کی Programming بھی تو ایک معینہ مدت تک ہے Expiry پر وہ

Delete کا بٹن دباتا ہے اور ہم سسٹم سے Out ہوتے چلے ہیں۔ اسی وقت کسی اور Enter کا بٹن دبا دیتا ہے اور کوئی نئی پروڈکٹ مارکیٹ میں آ جاتی ہے نئے تقاضوں کے مطابق نئی Programming کے ساتھ!

لیکن مَیں یہ سب ان سے نہیں کہتا۔۔۔ میری یہ باتیں سُن کر وہ مشکوک ہو جائیں گے۔۔۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں کسی شبہے کی تصدیق کریں گے اور مجھے ٹرانکولائز دے کر، میرے کمرے کے پردے گرا کر، مجھے سکون سے سو جانے کی تلقین کر کے خاموشی سے دبے پاؤں باہر نکل جائیں گے۔۔۔

میری ایسی باتوں نے اُنھیں مجھ سے کافی حد تک بدظن کر دیا ہے۔ میری اپنی Programming بھی تو شاید کچھ گڑبڑی ہوگئی ہے۔ میرے سسٹم کو کوئی وائرس ہولے ہولے چاٹ رہا ہے۔ میری سوچیں منتشر ہو رہی ہیں۔ کچھ دوسرے سسٹمز کے سگنل بھی میں ریسیو کر رہا ہوں۔ دوسری دُنیاؤں کی فریکوئنسیز مجھ پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔۔۔

شاید میری Discs کی پروگرامنگ اب Limited سے Unlimited کی طرف جا رہی ہے، لیکن کچھ پرانی باتیں ابھی بھی میری Memory میں موجود میں اسی طرح۔۔۔ اپنے عروج کے زمانے میں مَیں اس سے ملا تھا۔۔۔ وہ جو بے تحاشا خوبصورت تھی۔ گہری اداس آنکھوں والی۔ آئی تو وہ کسی کام سے تھی مگر مَیں اس کی انفرادیت کا اسیر ہو گیا تھا۔۔۔ تعلق مزید گہرا ہوگیا۔۔۔ مَیں نے اس سے پوچھا کہ تم اتنے پُرکشش جسم کو کیوں بیچتی ہو تو اس نے جواب دیا تھا ''یہی تو وہ Comodity ہے جس کی مارکیٹ کبھی بھی ڈاؤن نہیں ہوتی۔۔۔ کوئی ذہن بیچتا ہے۔ کوئی الفاظ، کوئی ضمیر بیچتا ہے تو کوئی ٹیکنالوجی، میرے پاس یہی کچھ ہے۔۔۔ ویسے بھی جسم ضمیر اور دل سے زیادہ قیمتی تو نہیں۔۔۔ مٹی کا ڈھیر ہے آج نہیں تو کل اسے کیڑوں مکوڑوں کی خوراک تو بننا ہی ہے۔۔۔ تو کیوں نہ ابھی سے جانوروں کے حوالے کر دوں، کچھ تو فائدہ ہوگا۔۔۔''

اس نے شاطر نظریں میرے چہرے پر گاڑ دی تھیں۔

''ویسے بھی جب ٹوٹے دروازوں سے صرف بھوک اور ننگ ہی اندر آنے لگے تو آخری جمع

پونجی خرچ تو کرنا پڑتی ہے۔۔۔'' مَیں اندر سے لرز گیا تھا۔۔۔ مجھے اس کی باتیں اچھی لگنے لگیں۔۔۔ میرا اسسٹم خراب ہونے کے دن آ گئے تھے۔۔۔

ایک دن بیٹے سے ہولے ہولے یہ سب کچھ کہا تو وہ کافی دیر تک پہلے تو بیٹھا مجھے دیکھتا رہا۔۔۔ پھر ایک لمبے تکلیف دہ وقفے کے بعد بولا ''ڈیڈی میرا خیال ہے آپ کا ایک تفصیلی چیک اپ دوبارہ ضروری ہے۔۔۔ لگتا ہے آپ ذہنی طور پر تھک گئے ہیں۔۔۔''

اور یوں میرے سسٹم کی خرابیوں کو دور کرنے کا ایک عجیب سا سلسلہ شروع ہو گیا۔۔۔ سائیکاٹرسٹ کی آرا سُن سُن کر میرے کان پک گئے۔۔۔ رنگ برنگی دوائیوں نے میری حِسِ ذائقہ کو ختم کر ڈالا، لیکن میرا احتجاج بے سود تھا۔۔۔ کوئی میری بات سنتا ہی نہ تھا۔۔۔ سنتا تھا تو سمجھتا نہ تھا۔۔۔ میرے احتجاج کو ابنارمل رویہ سمجھ کر اپنی عزّت کے خوف سے اپنے سٹیٹس کے کھو جانے کے خوف سے میرے دماغ کو سلا دیا جاتا ہے۔

اب مَیں اُنھیں کیسے سمجھاؤں کہ یہ تمام دوائیں، میرے جسمانی سسٹم کو بظاہر Slow کر دیتی ہیں لیکن کوئی دوسرا اسسٹم اندر ہی اندر Active ہو جاتا ہے۔۔۔ جو نہ میری گرفت میں ہے اور نہ تمھاری گرفت میں!

مجھے وہ سب کچھ دیکھنے، سننے لگتا ہے جو تمھارے سسٹم کی CDs پر موجود نہیں۔۔۔ تمھاری CDs تو وہاں No Response کا سگنل دینے لگتی ہیں۔ اب بتاؤ میرا کیا قصور ہے اس میں۔؟

تم سمجھتے ہو کہ مَیں ابنارمل ہو گیا ہوں۔۔۔ حالاں کہ مجھے وہ Wisdom حاصل ہو رہی ہوتی ہے جو عرفِ عام میں نارمل لوگوں کا نصیب نہیں۔ یہ باتیں مَیں نے اپنی بہو سے ڈرتے ڈرتے کہیں تو اس کے چہرے کی سکرین پر بار بار خوف لکھا جانے لگا۔۔۔ اس نے میرے کمرے کی طرف آنا چھوڑ دیا بیٹوں کو بھی منع کر دیا۔

''کسی لمحے کچھ بھی ہو سکتا ہے "He has gone Crazy"

یہ بات اس نے میرے سامنے تو نہیں کہی تھی لیکن مَیں نے اس کی آنکھوں کو بولتے سُن لیا

تھا۔۔۔

مَیں تو محض یہ سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ یہ ساری کائنات بھی تو کسی Central Computerised System کے کنٹرول میں ہے۔۔۔ ہر چیز مٹی کے ایک ذرّے سے لے کر پہاڑ تک، ایک بوند پانی سے لے کر سمندر تک، سب کچھ ایک خاص Programming کے تحت کام کر رہے ہیں۔ کوئی بیٹھا ہے Control D کے ساتھ کبھی Delete کا بٹن دبا دیتا ہے تو کبھی Enter کا (ایسے انکشافات آج کل زیادہ ہو رہے ہیں)

اور یہ جو ہر طرف کرپشن کا رونا ہے نا۔۔۔ یہ بھی لوگوں کی CDs میں خرابی کی وجہ سے بڑھ گئی ہے۔ عجیب عجیب سے وائرس سب کو چاٹ رہے ہیں اندر ہی اندر۔۔۔ شاید وہ خود بھی اس کھیل تماشے سے بُور سا ہو گیا ہے۔۔۔ اس نے بس گیم کو تھوڑا تیز کر دیا ہے تاکہ تصادم بڑھ جائیں اور اسے قیامت برپا کرنے کا جواز مل سکے۔۔۔ وہ کسی اور سکرین پر کوئی اور نئی گیم کھیلنے لگے گا۔

یہ باتیں سُن کر میرے پوتے بہت ہنسے تھے اور کہنے لگے ''دادا آپ تو بہت Creative ہیں، بہت اچھی کہانی لکھ سکتے ہیں۔۔۔'' مَیں نے اُنھیں بتایا بھی کہ یہ کہانی نہیں حقیقت ہے۔۔۔ لیکن وہ ہنستے رہے۔۔۔ حتیٰ کہ ان کی ماں اُنھیں ڈانٹ کر اٹھا لے گئی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ رات کو میرا بیٹا ایک نئے ڈاکٹر کو لے کر آ گیا جس نے پلمبر کی طرح ٹونٹیاں لگا کر مجھے ٹھونک بجا کر دیکھا۔۔۔ شاید میری Expiry Date کا اندازہ لگا رہا تھا۔۔۔ اس کی آنکھیں بولتی نہیں تھیں۔۔۔ لگتا تھا Circuits شاٹ ہو چکے ہیں اور بے چارہ خود Expire ہونے والا ہے۔

مَیں نے چپکے سے اپنے بیٹے کو کہہ دیا تھا کہ یہ غریب تو خود دو دن کا مہمان ہے اسے لے جاؤں یہاں سے۔۔۔

میرے بیٹے نے عجیب رحم آلود نگاہوں سے مجھے دیکھا۔۔۔ ایک لمبی سانس بھری۔ سر جھکائے چند لمحے کھڑا رہا، میرے بالوں کو پیار سے سیدھا کیا، آہستگی سے میری پیشانی کو چھوا۔ میری چادر برابر کی اور باہر نکل گیا۔

میری نگاہوں میں ڈاکٹر کا ہیولیٰ پھر رہا تھا، مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کے تمام سسٹم اب آف ہو رہے تھے۔ ایک Click ہو گی اور بس۔۔۔

اگلے دن شام کو میرا بیٹا دفتر سے سیدھا میرے کمرے ہی میں آ گیا۔ وہ بہت اُلجھا اُلجھا سا تھا۔ وہ حسبِ عادت چُپ کر کے بیٹھ گیا اور مجھے دیکھنے لگا۔

''خیریت تو ہے بیٹا۔۔۔''؟ اس کے روّیے نے مجھے بے چین کر دیا۔

''ڈیڈی ایمان داری سے بتایئے کہ کل ڈاکٹر کے بارے اتنی بڑی بات آپ نے کس بنیاد پر کہہ دی تھی۔

''کیا وہ مر گیا۔۔۔''؟ مَیں نے بے ساختہ پوچھا

''جی ہاں!'' وہ بولا

''تو تم کیوں اتنے پریشان ہو۔۔۔'' مَیں پُرسکون ہو گیا۔

''لیکن آپ کو کیسے پتہ چل گیا تھا۔۔۔''؟ وہ ابھی تک کنفیوژ تھا۔

''بیٹا چھوٹی سی بات ہے اس کے تمام سسٹم Off ہو چکے تھے۔ جو مَیں نے دیکھ لیا تھا''

''مگر کیسے۔۔۔''؟ وہ مضطرب تھا۔

''یہ تو مَیں بھی نہیں بتا سکتا۔۔۔'' مَیں نے بے بسی سے کہا۔ کاش مَیں اسے سمجھا سکتا۔۔۔ ہو سکتا ہے میری باتیں سُن کر وہ مجھے کسی مینٹل ہسپتال میں چھوڑ آتا۔۔۔ جو مجھے کسی صورت گوارا نہ تھا۔ سو مَیں نے آنکھیں بند کر لیں۔۔۔ اور وہ مشکوک سی نظریں لیے چلا گیا۔۔۔

لگتا ہے میرے کیس میں ''اس'' کا ہاتھ Delete کی بجائے کسی غلط بٹن پر پڑ گیا ہے۔ نہ میرے سسٹم کو سمجھ آتے ہیں اور نہ مَیں اپنی کسی سوچ کی وضاحت کر سکتا ہوں۔ دوسرے لفظوں میں شاید مَیں پاگل ہو گیا ہوں۔ میری قسم کے تمام لوگوں کا المیہ یہی تو ہے۔ سو ہمیں ''سسٹم بدر'' کر دیا جاتا ہے۔ حالاں کہ ہم تو شعور کی حدوں سے پرے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ بے چارے تو ابھی تک اپنے سسٹم کو Decode نہیں کر سکتے۔۔۔ ہم تک رسائی کیوں کر ہو گی ان کی۔۔۔

خیر کچھ عرصہ تو اسی صورتِ حال میں رہنا ہو گا۔۔۔ جب تک کہ میرے سسٹم کا کوئی الارم

Central Control کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرتا۔۔۔ یا وہ خود فی الحال توجہ نہیں دے رہا۔۔۔؟''

میرا بیٹا آنکھوں میں آنسو لیے اپنے دوست سے کہہ رہا ہے۔''میری تو کوشش رہی کہ ڈیڈی کو کسی بات سے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔۔۔اس لیے ڈاکٹرز کے کہنے کے باوجود اُنھیں ہاسپٹل نہیں داخل کروایا کہ وہ کہیں Feel نہ کریں۔۔۔کاش مَیں نے ڈاکٹرز کی مان لی ہوتی تو یہ ٹریجڈی نہ ہوتی۔۔۔''

بابا مَیں نے خود دادا کو چیختے سنا تھا۔۔۔وہ کہہ رہے تھے''مَیں اس حالت میں رہتے ہوئے تنگ آ گیا ہوں۔تم کیا سمجھتے ہو کہ Delete کا بٹن صرف تمھارے ہاتھ ہی میں ہے۔اپنے سسٹم کو Off کرنے کا طریقہ مجھے بھی آ گیا ہے۔۔۔''میرا بڑا پوتا سہما سہما سا بول رہا تھا۔

''اور پھر اُنھوں نے اپنی کلائی کی رگیں بلیڈ سے کاٹ لیں۔جانے وہ بلیڈ کہاں سے ان کے ہاتھ لگا تھا۔۔۔ہم تو بہت احتیاط کرتے تھے۔۔۔''میرے بیٹے کی آواز میں گہرا دکھ اور تاسف تھا اور مَیں سوچ رہا تھا یہ سب کتنے پاگل ہیں جو رو رہے ہیں، افسوس کر رہے ہیں۔مرے بیٹے کو تو میری کامیابی پر خوش ہونا چاہیے۔سبھی کے سسٹم ایک دن ختم ہو جاتے ہیں۔مَیں نے تو اپنا Delete کا بٹن دبا لیا۔!What a success کمال ہے یہ سب تو واقعی پاگل ہو گئے ہیں۔

☆☆☆

Central Control کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرتا۔۔۔ یا وہ خود فی الحال توجہ نہیں دے رہا۔۔۔؟''

میرا بیٹا آنکھوں میں آنسو لیے اپنے دوست سے کہہ رہا ہے۔ ''میری تو کوشش رہی کہ ڈیڈی کو کسی بات سے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔۔۔ اس لیے ڈاکٹرز کے کہنے کے باوجود اُنھیں ہاسپٹل نہیں داخل کروایا کہ وہ کہیں Feel نہ کریں۔۔۔ کاش مَیں نے ڈاکٹرز کی مان لی ہوتی تو یہ ٹریجڈی نہ ہوتی۔۔۔''

بابا مَیں نے خود دادا کو چیختے سنا تھا۔۔۔ وہ کہہ رہے تھے ''مَیں اس حالت میں رہتے ہوئے تنگ آ گیا ہوں۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ Delete کا بٹن صرف تمھارے ہاتھ ہی میں ہے۔ اپنے سسٹم کو Off کرنے کا طریقہ مجھے بھی آ گیا ہے۔۔۔'' میرا بڑا پوتا سہما سہما سا بول رہا تھا۔

''اور پھر اُنھوں نے اپنی کلائی کی رگیں بلیڈ سے کاٹ لیں۔ جانے وہ بلیڈ کہاں سے ان کے ہاتھ لگا تھا۔۔۔ ہم تو بہت احتیاط کرتے تھے۔۔۔'' میرے بیٹے کی آواز میں گہرا دُکھ اور تاسف تھا اور مَیں سوچ رہا تھا یہ سب کتنے پاگل ہیں جو رو رہے ہیں، افسوس کر رہے ہیں۔ مرے بیٹے کو تو میری کامیابی پر خوش ہونا چاہیے۔ سبھی کے سسٹم ایک دن ختم ہو جاتے ہیں۔ مَیں نے تو اپنا Delete کا بٹن دبا لیا۔ !What a success کمال ہے یہ سب تو واقعی پاگل ہو گئے ہیں۔

☆☆☆



فرحین چوہدری (شہابہ گیلانی) آج کے دور کی لڑکی کی نمائندہ ہے اس کی شخصیت کا جزوِ عظیم بلبلے ہیں۔ وہ سوڈے کی بوتل کی مصداق ہے جس میں سے بلبلے اٹھتے رہتے ہیں۔

فرحین (شہابہ) کے جذباتی سلف میں لہریں اٹھتی ہیں، چھینٹے اٹھتے ہیں، گھمن گھیریاں گھومتی ہیں۔ اس کا ذہنی سلف ایک جھیل کی مانند ہے، ٹھہرا ہوا نیلا شفاف پانی۔ فرحین ایک ایسی بہلی ہے جس کا ایک پہیہ گول ہے اور دوسرا چوکور، لیکن یہ بہلی چلتی ہے چلے جاتی ہے یوں جیسے پانی میں راج ہنس تیرتا ہے۔

ممتاز مفتی

فرحین چوہدری (شہابہ گیلانی) نے چھوٹی بڑی کئی طرح کی کہانیاں لکھی ہیں۔ سماجی حقیقت نگاری کی، تخلیقاتی اور رومانوی اپنی ذات کے اندر سفر کرنے کی، جگ بیتیاں، ہڈ بیتیاں اور پرندوں کے حوالے سے تمثیلی انداز کی۔ بعض کہانیاں روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات سے مرتب ہوتی ہیں اور ایسی کہانیاں جن میں وہ کسی نہ کسی روپ میں خود بھی موجود ہے زیادہ دلچسپ اور خوبصورت ہیں۔

منشا یاد

دستاویز
DASTAVEZ